خدا، رسول اور رسالت

آیت اللہ علامہ شہید سید محمد باقر صدرؒ

آیت اللہ شہید سید محمد باقر صدرؒ کی بیسویں سالگرہ منعقد کرنیوالی عالمی کانگرس

بسم الله الرحمن الرحيم

خدا، رسول اور رسالت

تألیف

آیت اللہ علامہ شہید سید محمد باقر صدر رح

آیت اللہ شہید سید محمد باقر صدرؒ کی بیسویں سالگرہ منعقد کرنیوالی عالمی کانگرس

صدر، محمد باقر، ۱۹۳۱ ـ ۱۹۷۹.

Sadr, Muhammad Baqir

خدا، رسول اور رسالت / تالیف محمد باقر صدر؛ [ترجمه حمید نثار زینپوری، احتشام عباس زیدی]. ـ قم: کنگره بین المللی آیه الله العظمی شهید صدر (قدس سره)، ۱۴۲۱ق. = ۱۳۷۹.

۸۸ص. ISBN 964 - 5660 - 18 - 0

فهرستنویسی براساس اطلاعات فیپا.

عنوان اصلی: الموجز في الرسول والرسالة.

۱. نبوت عامه. ۲. خداشناسی. ۳. فلسفه اسلامی. الف. کنگره بین المللی آیت الله العظمی شهید صدر (قدس سره). ب. زینپوری، احمد نثار، مترجم. ج. زیدی، احتشام عباس، مترجم. د. عنوان.

۴۰۲۶ م ۲ ص/ ۲۲۰/۱ BP ۲۹۷/۲۳

۱۳۷۹

کتابخانه ملی ایران ۲۰۵۱۷ ـ ۷۹م

کتاب کا نام :- خدا، رسول اور رسالت

مصنف :- آیت اللہ علامہ شہید سید محمد باقر صدرؒ

ناشر :- آیت اللہ شہید سید محمد باقر صدرؒ، عالمی کانگریس

خطاطی :- سید تقی حسین رضوی

سال طبع :- سنہ ۱۴۲۱ھ

پریس :- شریعت

تعداد :- تین ہزار

Qom: P.O. Box 37185 - 314 Tel: 7732758 - 7732849 - Fax: 7731151

URL: WWW.alsdar.com E-mail: info@alsadr.com

فہرست

◉ پیش لفظ	۸
◉ تمہید	۱۲
◉ المرسل ـ اللہ سبحانہ تعالیٰ	۱۵
◎ خداوند تعالیٰ پر ایمان	۱۶
● اسرار کائنات میں تجربہ کا کردار	۱۷
● منطقی اعتبار سے حسی نظریہ	۲۱
◎ وجود خدا کے ثبوت میں علمی استدلال	۲۴
● اس طریقۂ استدلال کی اہمیت	۲۸
● استدلال کے مراحل	۲۸
● علمی استدلال کی مثال	۳۱
◎ اس طریقہ سے ہم وجود صانع کے اثبات پر کیسے استدلال کر سکتے ہیں ؟	۳۶

- ◎ دلیل فلسفی ۴۴
  - ● وجود خدا پر دلیل فلسفی کے معنی ۴۴
  - ● دلیل کی قسمیں ۴۴
  - ● دلیل ریاضی ۴۴
  - ● دلیل علمی ۴۴
  - ● دلیل فلسفی ۴۴
  - ● اثبات صانع پر دلیل فلسفی کے چند نمونے ۴۶
  - ● کائنات کی مادی تفسیر ۴۸
  - ● کائنات کی میکانیکی تفسیر نہیں کی جا سکتی ۴۹
  - ● کائنات میں درجات کے اختلاف کا صحیح جواب ۵۰
  - ● اس دلیل کے مقابلہ میں مادہ پرستوں کا موقف ۵۲
  - ● جدید علم اور مادی تفسیر کے درمیان تنافی ۵۴
- ◎ اللہ تعالیٰ کے صفات ۵۸
  - ● عدل و استقامت ۵۹
  - ● قیامت کے دن جزاء ۶۰
- ◎ الرسولؐ ۶۱
- ◎ تمہید ۶۲

● مختار انسان ۶۲
● اجتماعی اور فردی مصالح میں ٹکراؤ ۶۴
● نبوت ۶۵
◎ رسول اکرمؐ کی نبوت کا اثبات ۶۶
◎ پیغمبرؐ کی تحریک اور رسالت میں مؤثر عوامل ۷۹
◉ الرّسالۃ ۸۱
◎ رسول اکرمؐ کی رسالت اور آپ کا پیغام اسلام ہے ۸۲

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی محمد وآلہ الطاہرین

بیسویں صدی کا دوسرا دور تھا کہ جب گزشتہ چند صدیوں سے اسلامی امت پر سایہ افگن ظلم واستبداد کے کالے بادل رفتہ رفتہ چھٹنے لگے۔ مسلمان قوم، جو عرصہ دراز سے جمود اور انحطاط کے اندھیرے میں گم تھی، اچانک سے روشنی کی نوید ملی۔ اور اسلامی وقار، جو عرصے سے مستکبروں اور ظالموں کے قدموں تلے روندا جا رہا تھا، یک بیک اس کے پیکر میں تازہ روح دوڑ گئی۔ اسلام کو ملنے والی یہ نئی زندگی درحقیقت ایران کے عظیم ترین رہنما اور بانی انقلاب حضرت امام خمینی قدس سرہ کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کا نتیجہ تھی اس عظیم انقلاب کی کامیابی کے بعد نہ صرف اسلام دوبارہ زندہ ہوا بلکہ اس میں نئی توانائی اور نیا جوش وولولہ پیدا ہوا، جس نے عالم کے مستکبروں اور استعماری طاقتوں کی نیندیں حرام کر دیں اور اسلامی ملکوں سے وابستہ ان کے منافع کو زبردست نقصان پہنچایا۔

امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے اسلامی انقلاب سے ملنے والی اس نئی زندگی نے اگر اسلامی امت کو پوری دنیا میں ایک متحدہ معاشرے کا تصور عطا کیا ہے تو بلاشبہ یہی نقطہ نظر عالم اسلام کے عظیم مفکر حضرت آیت اللہ علامہ شہید باقر صدرؒ کا بھی تھا۔ آیت اللہ علامہ شہید باقر صدر جدید اسلامی تحریک کے عظیم علمبردار تھے۔ آپ نے اپنے ہمہ گیر جدید افکار پر مشتمل گہری تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ امت اسلام کو روشنی کی ایک نئی راہ دکھائی اور اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔ آپ کی اسلامی ثقافتی و علمی تحریک نے غیر اسلامی اور مغربی افکار و رجحانات کو، جو اسلامی معاشرے پر تیزی سے حاوی ہو رہے تھے، اور فرزندان اسلام کو گمراہ کر رہے تھے، پیچھے دھکیل دیا اور اسلامی مفکرین کیلئے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دیں۔

آیت اللہ علامہ شہید باقر صدرؒ اپنی بے نظیر لیاقت اور نئی اسلامی فکر کے ذریعہ متمدن دنیا کے جدید دانشوروں اور نام نہاد مفکروں کے آگے آہنی دیوار کی مانند ڈٹ گئے اور مادی تمدن کی اعتقادی اور فکری بنیادوں کو یکے بعد دیگرے منہدم کر کے آپ نے بے دین اور الحادی افکار کی ناتوانی کو ثابت کر دیا اور اس کی ظاہری جاذبیت کا پردہ چاک کر دیا۔ اس طرح آپ نے آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کرنے والے مشرقی مفکروں کے سامنے آج کے انسانی معاشرے کی مشکلات کے حل کے سلسلے میں دینی نظریہ کی بے مثال تاثیر اور طاقت کو ثابت کر دیا اور یہ بتا دیا کہ نئی زندگی کی کشاکش میں صرف دین ہی انسان کی خیر و سعادت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

آیت اللہ شہید باقر صدر کے مکتب فکر کی جدت کسی ایک خاص محور اور موضوع سے مخصوص نہیں رہی ہے بلکہ آپ نے مختلف میدانوں میں، علی الخصوص عصر حاضر کے جدید تقاضوں کے تحت اسلامی فکر کی نئی شمعیں روشن کی ہیں۔ اسلامی اقتصاد، اسلامی فلسفہ و منطق کے ساتھ ساتھ آپ نے دینی علوم کے

میدان میں بھی فکر و نظر کے نئے چراغ جلائے ہیں اور فقہ و اصول، فلسفہ و کلام اور تفسیر و تاریخ پر بھی پئے جدید نظریات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ نتیجہ میں ان تمام علوم میں اس وقت ایک نیا انقلاب نظر آتا ہے اور یہ فکری انقلاب ہر علم کے ماہر و محقق کو نت نئے میدانوں کی راہ دکھاتا ہے۔

آیت اللہ علامہ شہید سید محمد باقر صدرؒ کی المناک شہادت کی دو دہائیاں گزرنے کے باوجود آج بھی علمی حلقے اور تحقیقاتی مراکز اس عظیم شہید کے علم و دانش سے استفادہ کر رہے ہیں اور ان کے علمی آثار اور جدید افکار کی ضرورت کا احساس بحث و تحقیق کے مختلف میدانوں میں کیا جا رہا ہے۔

اس ضرورت و اہمیت کے پیش نظر شہید صدرؒ سے متعلق عالمی کانگریس نے یہ طے کیا کہ شہید رہ کے شایان شان ان کی علمی اور ثقافتی میراث کو وسیع پیمانے پر زندہ کر کے دنیا کو ان قیمتی افکار سے روشناس کرایا جائے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ کے آثار کا ایک بڑا حصہ طباعت اور اشاعت سے گزر چکا ہے، اس عالمی کانگریس کے سامنے دو اہم فریضے آتے ہیں:

۱۔ آیت اللہ علامہ شہید صدرؒ کے آثار کو دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں نہایت دقت اور امانتداری کے ساتھ ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔

۲۔ خود شہید کے دست مبارک کی تحریروں کو انتہائی تحقیق اور سعی و تلاش کے ساتھ فراہم کیا جائے تاکہ ان کی تالیفات کی پے در پے اشاعتوں کے نتیجے میں وجود میں آنیوالی غلطیوں کی دقیق اصلاح ہو سکے اور انہیں نئے سرے سے دقت نظر کے ساتھ شائع کیا جائے۔

شہید صدرؒ کے علمی آثار میں سے وہ کتاب جسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کی غرض سے اولویت حاصل ہوئی، کتاب "المرسل، الرسول، الرسالہ" ہے۔ اس کتاب کو شہید صدرؒ نے اپنی کتاب "الفتاوی الواضحہ" کے مقدمے کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ "الفتاوی الواضحہ" ان کی فقہی آراء اور فتاویٰ پر

مشتمل ایک مکمل کتاب ہے ۔

شہید صدرؒ نے اس مقدمہ میں شیعہ فقہا کی دیرینہ روش پر دینی عقائد کو مختصر لیکن استدلالی انداز میں تحریر فرمایا ہے ۔ موضوع کی اہمیت اور جدت روش کے پیش نظر یہ مقدمہ بارہا شائع ہوچکا ہے ۔

ہم اس کا اردو ترجمہ شائع کرکے اردو قارئین کی نذر کر رہے ہیں ۔ امید ہے یہ کام معارف اہل بیتؑ کی نشر و اشاعت کی راہ میں ایک اچھا قدم ثابت ہوگا ۔

مجھ سے بعض علماء اعلام، بہت سے طلبہ اور اکثر مومنین نے یہ فرمائش کی کہ میں سابق علماء کی اقتداء کرتے ہوئے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھاؤں جس کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

ان علماء کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے رسالہ عملیہ کے ساتھ ہی اصول دین اور معرفت صانع سے متعلق ایک باب کا اضافہ کر دیتے تھے۔ یا اس کے لئے ایک مختصر یا تفصیلی مقدمہ لکھتے تھے۔ کیونکہ رسالہ ایک اجتہادی تعبیر ہے۔ یعنی شریعت کے وہ احکام جن کے ساتھ خدا نے خاتم النبیین رحمۃ للعالمین ؐ کو بھیجا ہے یہ احکام بنیادی طور سے اصول دین پر استوار ہیں۔ یعنی احکام کو بھیجنے والے خدا پر ایمان اور اس کی طرف سے مبعوث پیغمبرؐ اور رسالت پر یقین، ہر رسالۂ عملیہ کی غرض کو تشکیل دیتے ہیں اور اس کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں رسالۂ عملیہ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

میں نے سب کی یہ خواہش قبول کر لی، میں سمجھتا ہوں کہ اس میں خدا کی رضا ہے اور یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ لیکن یہ سوال پیش آتا ہے کہ میں یہ مقدمہ

کس اسلوب سے لکھوں ؟ کیا اسے اسی اسلوب کے ساتھ لکھوں کہ جس طرح اس کتاب "فتاوای واضحہ" کو پیش کیا ہے یا انھیں استدلالی روش کے ساتھ لکھوں ؟

لیکن یہاں میں نے محسوس کیا کہ اس مقدمہ اور "فتاوای واضحہ" کے درمیان بنیادی فرق ہے، کیونکہ فتاوی میں احکام اور اجتہاد واستنباط کے نتائج کو استدلال و بحث کے بغیر پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ مدنظر مقدمہ کو یوں ہی پیش کردینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں استدلال کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اصول دین میں شرعی لحاظ سے یقین حاصل کرنا واجب ہے۔ اور مقدمہ کا مقصد دین کے ستون اور اس کی جڑوں کو مستحکم و مضبوط کرنا ہے۔ اور یہ مقصد استدلال کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ پھر استدلال کے بھی درجات ہیں۔ اور جو استدلال جتنا واضح و سادہ ہوتا ہے اتنا ہی مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر آزاد فکر انسان ہے تو حکیم صانع پر ایمان لانے کیلئے سادہ استدلال ہی کافی ہے۔ "**ام خلقوا من غیر شیء ام هم الخالقون**" (طور/۳۵) کیا وہ بغیر کسی چیز کے پیدا کردیئے گئے ہیں یا وہی خالق ہیں۔" لیکن دو سو سال سے نئی فکر نے ضمیر کی آزادی اور صفائے قلب کو سلب کرلیا ہے، لہٰذا اس دور میں ایسا استدلال ضروری ہے، جو جدید افکار، نئی روش و تحقیق اور نافذ و بسیط اور بدیہی ترین دلائل پر مبنی ہو۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے ہیں، یا تو میں جدید فکر کے طریقوں سے چشم پوشی کرکے انھیں لوگوں کیلئے قلم اٹھاؤں جو ابھی تک سادگی، آزادی اور پاک ضمیری کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔ اور سادہ استدلال کو کافی سمجھتے ہیں تو اس صورت میں اکثر "فتاوای واضحہ" کے قارئین کے لئے عبارت واضح ہوگی۔

یا ان افراد کے لئے خامہ فرسائی کروں جو نئی فکر سے متاثر ہیں یا ان مسائل پر تحقیق کرتے ہیں اور مسائل الٰہیات سے بھی نا آشنا ہیں۔ میری نظر میں دوسرا طریقہ زیادہ شائستہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

اگرچہ میں نے اپنی تحریر کو عام پڑھے لکھے لوگوں پر واضح کرنے کیلئے یا حوزۂ علمیہ کے طلبہ کی سطح پر لکھا ہے اور جہاں تک ممکن تھا مشکل اصطلاحات سے احتراز کیا ہے، یا بقدر امکان زبان ریاضی سے پرہیز کیا ہے، بعض پیچیدہ مسائل کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے جنکی تفصیل میں نے اپنی دوسری کتابوں جیسے "استقرائی منطق کی بنیادیں" میں بیان کی ہیں۔ اس کے باوجود اس مختصر مقدمہ میں قاری کے لئے یہ ممکن ہے کہ ان مسائل سے متعلق مطمئن کرنے والے فکر و استدلال کا سرمایہ حاصل کر سکے۔

اس رسالہ میں ہم پہلے خدائے حکیم (مرسِل) سے متعلق، پھر پیغمبر اکرم (رسول) کے بارے میں گفتگو کریں اور آخر میں "رسالت" کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ وما توفیقی الّا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب...

المرسل

(اللہ سبحانہ وتعالیٰ)

○ خداوند تعالیٰ پر ایمان

○ اللہ تعالیٰ کے صفات

خداوند تعالیٰ پر ایمان

انسان فلسفہ و استدلال کے مرحلہ تک پہونچنے سے پہلے بہت قدیم زمانہ سے خدا پر ایمان رکھتا، اس کی عبادت کرتا اور اسے عیوب سے پاک جانتا ہے اور خدا سے اپنے عمیق ارتباط کا احساس کرتا چلا آرہا ہے۔

یہ ایمان نہ طبقاتی تناقض کی پیداوار ہے، نہ ظالم استعمار کی ایجاد ہے اور نہ ہی اپنی آزادی کیلئے ستم دیدہ لوگوں کی اختراع ہے، بلکہ خدا پر ایمان ان تناقضات کے وجود میں آنے سے پہلے سے تھا۔

یہ ایمان، مادہ و طبیعت کے درمیان ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے خوف کی دین بھی نہیں ہے، اگر دین خوف کی پیداوار اور رعب کا نتیجہ ہوتا تو ہر زمانہ میں زیادہ تر لوگ دیندار ہوتے کہ وہ زیادہ ڈرتے اور جلد گھبراتے تھے۔ جبکہ تاریخ میں دین کے علمبردار زیادہ تر نڈر اور باہمت افراد تھے۔

بلکہ اس ایمان کا سرچشمہ انسان کی وہ اصیل فطرت ہے جس کا تعلق اپنے خالق سے ہے۔ اور راسخ وجدان اپنی فطرت کے ذریعہ اپنے پروردگار سے انسان کے تعلق کو بخوبی سمجھتا ہے۔

بعد والے زمانوں میں جب انسان فلسفی بن گیا اور اس نے اپنے آس پاس کی چیزوں سے وجود و عدم و وجوب و امکان، استحالہ، وحدت و کثرت کائنات میں ترکیب و بساطت، جزء و کل، تقدم و تاخر اور علت و معلول کا ایک کلی مفہوم اخذ کیا تو وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوا کہ ان مفاہیم کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور میدان استدلال میں انکی مطابقت اس طرح کی جاسکتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی بنیاد قائم ہوسکتی ہے اور فلسفی بحثوں کے اسلوب میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔

اسرار کائنات میں تجربہ کا کردار

جب علمی بحثوں کے میدان میں تجربہ سامنے آیا اور ٹیلیسکوپ اور مائکرا سکوپ وغیرہ ایجاد ہوگئے اور مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ عام مفاہیم طبیعت میں مادہ کو اس کے قوانین کے انکشاف اور اسرار کائینات کو سمجھنے کیلئے کافی نہیں ہیں تو انہوں نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ کائنات کے اسرار و قوانین کو حس و تجربہ ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کائنات کے اسرار و قوانین کی تحقیق انھیں دونوں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے، اور یہی حسی و تجربی طریقہ کائنات سے آگاہ ہونے کیلئے عام لوگوں کیلئے مفید ہے، اور اس کا دامن بہت وسیع ہے۔

دانشوروں نے اس طریقہ پر بہت زور دیا ہے اور کہا ہے کہ حس و تجربہ ایسے دو آلے ہیں جو اسرار کائنات اور اس کے وسیع نظام کو سمجھنے میں عقل کو مدد دیتے ہیں۔ انسان کو بجائے اس کے کہ یونانی دانشور ارسطو کے مانند خاموشی سے

کمرہ میں بیٹھ کر غور کرے اور اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ فضا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے اجسام قوۃ متحرکہ کے ختم ہوجانے کے بعد ٹھہر جاتے ہیں، بہتر ہے کہ گیلو کے تجربہ پر عمل کرتے ہوئے اجسام متحرک کے بارے میں اپنے تجربات کا مشاہدہ کرے اور ان مشاہدات کی تکرار کرے اور روابط کو نظم دے کر یہ سراغ لگائے کہ اگر کوئی قوت متحرکہ کسی جسم کو حرکت میں لائے تو یہ مذکورہ متحرک جسم تب تک سکون میں نہیں آتا جب تک کہ حرکت میں لانے والی قوت کے مقابلے میں اسکو روکنے والی کوئی قوت آکر حرکت دینے والی قوت کیلئے رکاوٹ بن جائے۔

انکشافات اور کائنات کے اسرار تک پہونچنے کے سلسلہ میں دانشوروں کی ہمت بڑھ گئی چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انہوں نے دو طریقوں سے کام شروع کیا۔

۱۔ مرحلۂ حس و تجربہ اور اس کے نتائج۔

۲۔ مرحلۂ عقل۔ یعنی نتائج اخذ کرتے اور ان کی ترتیب کا مرحلہ تاکہ ایک کلی اور قابل قبول نظریہ حاصل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی علمی انکشاف میں حسی طریقہ عقل سے مستغنی نہیں رہا ہے اور کوئی بھی طبیعی ہیئت عقل کے بغیر صرف حس و تجربہ کے ذریعہ اسرار کائنات میں سے کوئی راز اور طبیعت کے قوانین میں کسی قانون کا انکشاف نہیں کر سکا ہے۔ کیونکہ مرحلہ اول میں اسے مشاہدات و تجربات حاصل ہوتے ہیں اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں وہ اپنی عقل سے ان کا موازنہ کرتا ہے تب کسی نتیجہ تک پہونچتا ہے۔

اور ہمیں کوئی ایسی علمی کامیابی نظر نہیں آتی کہ جو دوسرے مرحلہ سے مستغنی ہو اور دونوں مرحلوں سے نہ گذری ہو۔ یعنی پہلے مرحلہ کے قضایا محسوس امور ہوتے ہیں اور دوسرے مرحلہ کے قضایا نتائج اخذ کرنے والے امور ہوتے ہیں جنھیں عقل درک کرتی ہے۔ مثلاً نیوٹن نے کشش وجاذبہ کی قوت کو صرف حس کے ذریعہ دریافت نہیں کیا۔ اور یہ بھی حس کے ذریعہ معلوم نہ کیا کہ دو جسموں کے مرکزوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہونے سے نتیجہ معکوس ہوتا ہے بلکہ اس نے حس کے ذریعہ معلوم کیا کہ جو پتھر اوپر پھینکا جاتا ہے وہ زمین پر گرتا ہے۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے، اور ستارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ ان چیزوں کو باہم جمع کیا اور ان پر غور کیا۔

ساتھ ہی زمین پر گرنے والے اجسام کے بارے میں گلیلو کے اور ستاروں کی گردش سے متعلق کیپلر کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اس نے قانون جاذبہ کو دریافت کرلیا۔ ہستی کے نظام سے بحث کے سلسلہ میں یہی حسی اور تجربی طریقہ، نئے نئے انکشافات کے سبب خدا پر ایمان کے سلسلہ میں نئی راہ قائم کرسکتا ہے۔ مادیوں نے اس مسئلہ پر جو ایک اہم فلسفی مسئلہ ہے اور معرفت انسانی کے اہم مسائل میں سے ہے، توجہ نہ کی۔ انہوں نے عجلت پسندی میں فلسفی اور منطقی افکار سے الگ لے سائنسی نقطۂ نظر سے پیش کیا کہ صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے معرفت حس اور انسان کی شناخت حس کے قلمرو سے باہر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جو محسوس نہیں ہے اور تجربہ سے باہر ہے اس کا اثبات نہیں کیا جاسکتا ہے، انہوں نے اس حسی اور تجربی نظریئے سے خدا پر ایمان والی فکر کو کچلنا چاہا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک خدا کو محسوس

نہیں کیا جائیگا دیکھا نہیں جائیگا اس وقت تک اس کا اثبات بھی نہیں کیا جاسکے گا۔
پس خدا کے اثبات اور اس کے علم کی کوئی راہ موجود نہیں ہے۔ البتہ اس توجیہ اور حسّی نظریہ سے خدا کے وجود کا انکار مادی دانشوروں سے پہلے فلاسفر نے کیاہے۔ فلاسفہ تھے اور ہیں جنھوں نے حس و تجربہ کی راہ اپنائی اور اسے خداوند عالم کی نفی اور اپنے غلط اعتقادات کے اثبات میں استعمال کیا۔ چنانچہ یہی غلط افکار تدریجی طور پر تناقضات کا سبب بنے ہیں، غلط افکار و نظریات اس حد تک پہنچے کہ فلسفی لحاظ سے بعض واقعی چیزوں کا انکار کرنے پر مجبور ہوئے یعنی اس دنیا ہی کا انکار کر دیا جسمیں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس حس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور حس کے ذریعہ صرف اشیاء کا علم ہوتا ہے جس طرح وہ ہمیں محسوس کراتی اور دکھاتی ہیں۔ ہمیں انکا کماحقہ علم حاصل نہیں ہوتا ہے۔ نتیجہ ہوا کہ ممکن ہے ہم کسی چیز کو محسوس کریں اور اپنے احساسات میں اس کے وجود کا اذعان کریں۔ لیکن خارج میں اس کے وجود کے ارتباط کے لئے ہمارے پاس کوئی راستہ نہ ہو۔ مثلاً آپ آسمان پر چاند دیکھتے ہیں تو اس وقت یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اور آپ اسے محسوس کر سکتے ہیں لیکن کیا درحقیقت آسمان پر چاند ہے؟ اور آپ کے آنکھ کھولنے اور دیکھنے سے پہلے اس کا وجود تھا؟ اس فکر و نظر کے حامل افراد نے یہ محسوس تو کیا، لیکن اسکی پیروی نہ کر سکے۔ بالکل ایسے ہی جب ایک احول بھینگے کو ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جنکا وجود نہیں ہوتا اور وہ ان کے دیکھنے پر زور دیتا ہے، لیکن ان اشیاء کے خارجی وجود کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ اسی غلطی کی وجہ سے انہوں نے فلسفی پہلو کو حس سے جدا کر لیا اور اشیاء کے خارجی وجود کا انکار کر دیا۔

منطقی اعتبار سے حسّی نظریہ

منطق کہتی ہے کہ جس قضیہ کو حس و تجربہ کی رو سے سچا یا جھوٹا نہ کہا جا سکے وہ مہمل ہے۔ ان کی مثال پراگندہ حروف تہجی کی سی ہے۔ لیکن جس جملہ "قضیہ" کو سچا یا جھوٹا کہا جا سکے وہ بامعنی کلام ہے۔

پس اگر حس سے یہ ثابت ہو کہ قضیہ کا مدلول واقع کے مطابق ہے، تو وہ قضیہ سچا اور اگر اس کے برعکس ثابت ہو تو جھوٹا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے سردیوں میں بارش ہوتی ہے تو یہ قضیہ بامعنی ہے، اور اس کا مدلول سچا ہے۔ اگر یہ کہے گرمیوں میں بارش ہوتی ہے تو یہ قضیہ بھی بامعنی ہے لیکن اس کا مدلول جھوٹا ہے۔ اگر یہ کہے کہ شب قدر میں ایک چیز نازل ہوتی ہے جس کو دیکھنا یا محسوس کرنا ناممکن ہے، ایک چیز ہے جس کو نہ محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ دیکھا جا سکتا ہے شب قدر میں نازل ہوتی ہے۔ یہ جملہ مہمل ہے چہ جائیکہ اس کو سچا یا جھوٹا کہا جائے۔ کیونکہ حس کے ذریعہ اس کے سچ یا جھوٹ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ کہیں "دیز" (ایک مہمل لفظ) شب قدر میں نازل ہوتی ہے، یہ دونوں جملے ایک جیسے ہیں۔ بنابرایں اگر آپ کہیں کہ اللہ موجود ہے تو ایسا ہی ہے کہ آپ کہیں "دیز موجود ہے"۔ تو جیسے یہ مہمل ہے۔ اسی طرح "اللہ موجود ہے" بھی مہمل ہے، معاذ اللہ کیونکہ حس و تجربہ کے ذریعہ خدا کے وجود کی معرفت ناممکن ہے۔

بہ ظاہر منطقی توجیہ بھی تناقض کا شکار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منطق کہتی ہے کہ
"ھذا" اور "ما" میں عمومیت ہے۔ جبکہ عمومیت کو حس کے ذریعہ نہیں پہچانا جا سکتا
تو مفروضہ کے تحت یہ بھی مہمل ہے۔ پس یہی فکر منطقی جو یہ کہتی ہے کہ ہر وہ جملہ جو حس و
تجربہ سے ثابت نہ ہو خود بھی مہمل ہے۔ یہ قاعدہ تعمیم کو خود بھی شامل ہے کیونکہ تعمیم حس سے
تجاوز کرتی ہے اس لئے کہ حس جزئی حالات کو درک کرتی ہے۔ اس طرح یہ قاعدہ خود
اپنے خلاف ہوتا ہے۔ اس قاعدہ کے اندر تناقض ہے۔ اور یہ قاعدہ ان تمام عمومی علمی
قواعد کو ملیامیٹ کر دیتا ہے کہ حس کے ذریعہ دانشوروں نے کائنات کے ظواہر کی تفسیر
کی تھی، اسی لئے تعمیم کا احساس ممکن نہیں ہے بلکہ وقوعوں یا حسی دلائل سے کلی مفہوم اخذ
کیا جاتا ہے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ علم نے بھی اپنی ترقی کی راہ میں اس فکر کو اہمیت
نہیں دی ہے، اور تمام انکشافات کو پہلے حس و تجربہ سے شروع کیا اور اس فلسفی
و منطقی پابندیوں سے نکل گیا ہے تاکہ اسرار کائنات کے سلسلہ میں عقل سے کام لے
اور مادیت و الٰہیت نیز جدید میٹیریلزم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حس اس دائرہ سے
باہر نکل جاتی ہے کہ جس میں محدود رہنے کی مادیت دعوت دیتی ہے اور اس بات کو دونوں
قبول کرتے ہیں کہ معرفت کے دو مرحلے ہیں:

۱۔ حس و تجربہ کی جمع آوری

۲۔ اس کی عقلی و نظری تفسیر

الٰہی و مادی نظریہ میں اختلاف اس کی تبیین و تفسیر یعنی دوسرے مرحلہ میں ہے۔
مادیت اپنی تفسیر کی بنیاد خدا کے وجود کی نفی پر رکھتی ہے اور الٰہی نظریہ کے

معتقد افراد کہتے ہیں کہ ان نتائج کی تفسیر خدائے حکیم پر اعتقاد اور اس کے اقرار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ذیل میں ہم خالق حکیم کے وجود پر دو طرح کے استدلال وارد کرتے ہیں اور دونوں طریقوں یعنی پہلے مرحلے میں حسی و تجربہ کے نتائج سے اور دوسرے مرحلہ میں اس کی عقلی توضیح و تبیین کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہانِ وجود کا ایک خالق حکیم ہے۔

۱- پہلے طریقہ کو دلیل علمی یا استقرائی کہتے ہیں۔
۲- اور دوسرے طریقہ کو دلیل فلسفی کہتے ہیں۔

وجود خدا کے ثبوت میں علمی استدلال

اب ہم دلیل علمی سے آغاز کرتے ہیں۔ پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے کہ دلیل علمی کا مقصد کیا ہے۔ دلیل علمی وہ دلیل ہے جو تجربہ اور محسوسات پر تکی ہو اور اس کا طریقہ وہی استقرائی ہے جو احتمالات پر مبنی ہے۔

اس لحاظ سے جس روش علمی سے ہم خدا کے وجود کے اثبات کے لئے استفادہ کرتے ہیں وہی استقرائی طریقہ ہے جو احتمالات کے حساب پر قائم ہے۔ اس مطلب کی آگے وضاحت کی جائے گی۔

دلیل استقرائی روش احتمالات کی بنیاد پر ہے اور احتمالات پیچیدہ فارمولوں کے حامل ہوتے ہیں جو نہایت دقیق ہیں جس کا مکمل جائزہ کتاب "اسس المنطقیہ" میں لیا گیا ہے۔ نظریہ احتمالات کو استدلالات کی سنگلاخ وادیوں سے گزرنے کے بعد سادہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہاں ایک دوسرا مطلب ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس طریقۂ استدلال کی تعریف جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں اور اس کی مختصر و سادہ وضاحت۔

۲۔ اس طرز استدلال کی اہمیت اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر اعتماد کی

حدود. البتہ یہ چیز ہم منطقی تحلیل اور منطقی و ریاضی بنیاد پر نہیں کریں گے ۔ کیونکہ یہ پیچیدہ چیزوں میں داخل ہونے پر مجبور کرے گا۔ بلکہ جس نہج سے ہم وجود صانع کے اثبات پر استدلال کریں گے اسے عام لوگوں کے طریقہ کے لحاظ سے پیش کریں گے، جس پر ہر صحیح و سالم انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں عمل کرتا ہے ، جس سے ہر حقیقت کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور علمی و تجربی بحثوں میں جن سے کام لیا جاتا ہے اسی سے وجود صانع پر استدلال کریں گے۔

آنے والی بحثوں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ وجودِ صانع پر استدلال کا طریقہ وہی ہے کہ جس سے ہم روزمرہ کے اور علمی حقائق کا اثبات کرتے ہیں ۔ جب ہم اس سے حقائق کے اثبات پر اعتماد کرتے ہیں تو تمام حقائق کے سرچشمہ وجود صانع کے اثبات کے سلسلہ میں بھی اس پر اعتماد کرنا چاہئے۔

برائے مثال جب آپ کو ڈاک کے ذریعہ خط ملتا ہے تو اسے پڑھتے ہی آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آپ کے بھائی کا خط ہے ۔ جب آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر نے بہت سے مریضوں کا علاج کامیاب طریقہ سے کیا ہے تو آپ کو اس پر اعتماد ہو جاتا ہے اور اسے ماہر ڈاکٹر سمجھنے لگتے ہیں اور چند مرتبہ پنسلین کے استعمال سے بدن میں خارش کے احساس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ آپ کے بدن میں پنسلین کی وجہ سے خارش ہوئی ہے۔

ان تمام استدلالات کی اساس حساب احتمال و امکان پر ہے اور ان میں استقراء کا طریقہ استعمال ہوتا ہے ۔ ایک طبعیات کا ماہر بھی اپنی سائنسی تحقیق میں جب نظامِ شمسی

کے مجموعہ میں بعض معین خصوصیات کو دیکھتا ہے تو وہ اس کی روشنی میں یہ سمجھتا ہے کہ اس منظومہ کے اجزاء سورج ہی کا جزو تھے جو اس سے جدا ہوئے ہیں۔ اور نیپٹون ستارہ کو حسی طور سے کشف کرنے سے پہلے اور ٹیلسکوپ کے ذریعہ اس کی حرکات کو دیکھنے سے پہلے ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شمسی نظام کا جزو ہے اور مائیکرسکوپ کے ذریعہ الیکٹرون کو دیکھنے سے پہلے ہی اس کے وجود کا یقین کیا جا چکا تھا۔ ان تمام موقعوں پر سائنسدانوں نے درحقیقت اسی دلیل استقرائی کا طریقہ اختیار کیا ہے جو حساب احتمال پر قائم ہے۔

اور وہی طریقہ ہے کہ جس سے ہم خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔

اب ہم طریقۂ استقراء کی وضاحت کرتے ہیں جو کہ احتمالات پر قائم ہے۔ اسے پانچ حصوں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حس و تجربہ کی دنیا میں ہمارے سامنے بہت سے وقوعے آتے ہیں

۲۔ ان محسوسات کی جمع بندی کے بعد ان کی تفسیر کا مرحلہ آتا ہے، اس مرحلہ پر ہم ان وقوعوں کی تفسیر کا صحیح فرضیہ تلاش کرتے ہیں اور صحیح تھیوری سے مراد ایسا فرضیہ ہے جو ان وقوعوں کے مطابق ہو جو یکجا ہونے والے ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

۳۔ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر یہ فرضیہ صحیح نہ ہو اور حقیقت میں ثابت نہ ہو تو ان وقوعوں کا جمع ہونا فضول ہوگا یعنی اجتماع کی صورت میں ان کا وجود و عدم یکساں ہوگا یا کم از کم ان میں سے ایک کے نہ ہونے سے اس کے نتائج ضعیف ہوں گے۔ جیسے سو یا ہزار میں ایک کا نہ ہونا جو سو یا ہزار کے مجموعہ کو بے اعتبار کر دیتا ہے۔

۴۔ ان وقوعوں کے اجتماع سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر ہمارا فرضیہ صحیح ہے تو اس کی دلیل وہ وقوعے ہیں جنھیں ہم نے پہلے حصہ میں حس و تجربہ سے دریافت کیا ہے۔

۵۔ ان وقوعوں کا اثبات تیسرے حصہ کے مفروضہ کا عکس ہے کیونکہ وہاں ہم نے ان وقوعوں کے وجود کے احتمال اور مفروضہ کے کذب کے فرض پر ان کے عدم کے احتمال کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ یہ نسبت جتنی کم ہوگی اتنا ہی اثبات کا امکان زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات میں اس فرضیہ کے صحیح ہونے پر کامل یقین ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ان موارد میں احتمال کی قیمت کو پرکھنے کے لئے دقیق معیار موجود ہیں جن کی اساس خود نظریۂ احتمال پر ہے۔ انسان عادتاً ان معیاروں اور ضابطوں کو بڑی حد تک صحیح طور پر کام میں لاتا ہے، اس لئے ہم یہاں احتمال کی فطری حیثیت پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کو پرکھنے کے لئے منطقی و ریاضی کی پیچیدگیوں میں نہیں جاتے۔

یہ وہ خطوط ہیں جنھیں ہم احتمالات کے حساب پر مبنی ہر استقرائی استدلال میں اپنی روزمرہ زندگی خواہ علمی تحقیق کے میدان میں بروئے کار لاتے ہیں۔

اس طریقۂ استدلال کی اہمیت

ہم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ قطعیات اور مثالوں کے ذریعہ اس طریقہ استدلال کی اہمیت کو بیان کریں گے چنانچہ اب ہم اپنی روزمرہ کی زندگی کی مثال کے ذریعہ اس کا آغاز کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے یہ مثال پیش کی تھی کہ جب ڈاک کے ذریعہ آپ کو خط ملتا ہے اور آپ اسے دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آپ کے بھائی کا خط ہے، کسی دوست کا نہیں ہے۔ آپ کا یہ یقین کرنا کہ یہ خط آپ کے بھائی کا ہے کسی اور کا نہیں ہے یہ بھی دلیل استقرائی کے ہی ذریعہ ہے، ان احتمالات کی بنیاد پر جس کی آپ کو عادت ہے درحقیقت یہ ایک ایسا قضیہ ہے کہ جس میں طریقۂ استقراء کو آپ قبول کر چکے ہیں۔

استدلال کے مراحل

پہلے مرحلہ میں اس خط میں آپ کے سامنے چند وقوعے آئیں گے، جیسے اس پر لکھا ہوا نام آپ کے بھائی کا نام ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہے ، اس کی تحریر آپ کے بھائی کی تحریر

ہے اس پر لکھے ہوئے الفاظ اسی انداز سے لکھے ہوئے ہیں جس انداز میں آپکے بھائی
الف، ب، ج، د اور ر لکھتے ہیں اور الفاظ کے نشست اور ان کے درمیان فاصلہ کا
بھی وہی اسلوب ہے آپ کے بھائی کو جس کی عادت ہے۔ انداز بیان اور الفاظ کی
متانت کا وہی طریقہ ہے جو آپ کے بھائی کا طرز تحریر ہے، اس خط میں جو املا کی
غلطیاں ہیں اور اس سے جو معلومات کی سطح کا اندازہ ہوتا ہے وہ آپ کے بھائی سے
ملتا جلتا ہے۔ جو چیزیں خط میں مرقوم ہیں آپ کے بھائی زیادہ تر ایسی باتیں کرتے ہیں۔
اسی طرح خط میں جن چیزوں کو طلب کیا گیا ہے آپ کے بھائی کو ان چیزوں کی ضرورت
ہے اور انھیں صرف آپ ہی جانتے ہیں یہ جمع آوری بھی ایک قسم کا استقراء ہے۔

دوسرے مرحلہ پر آپ خود سے سوال کرتے ہیں کیا حقیقت میں یہ خط آپ کے
بھائی کا ہے یا کسی ایسے آدمی نے بھیجا ہے جو بھائی کا ہمنام ہے؟

یہاں ان وقوعوں کو جمع کرنے کیلئے ایک فرضیہ صحیح ہے اور وہ یہ کہ یہ خط
آپکے بھائی کا ہے تو فطری بات ہے کہ یہ وقوعوں کی جمع بندی کا نتیجہ ہے جیسا کہ
پہلے مرحلہ میں تھا۔

تیسرے مرحلہ میں آپ خود سے یہ سوال کرتے ہیں: اگر یہ خط بھائی کا نہیں
ہے بلکہ کسی دوسرے آدمی کا ہے تو اس صورت میں زیادہ دقت درکار ہے کہ کیا یہ
خصوصیات دوسرے آدمی میں جمع ہو سکتی ہیں، یہاں ایسے بہت سے فرضیوں
کے جمع ہونے کی ضرورت ہے جو کہ کسی ایسے آدمی کو تشکیل دے سکیں کہ جس کا

نام، انداز، تحریر اور املا و انشاء کا اسلوب آپ کے بھائی سے ملتا ہو۔ اس اتفاق کا احتمال بہت کم ہے اور ان اتفاقات کا سلسلہ جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی قضیہ کا احتمال ضعیف ہوتا چلا جائے گا۔ اور "اسس المنطقیہ" میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ احتمال کیسے ضعیف ہوتا ہے۔ جب اتفاقات زیادہ ہو جاتے ہیں تو قضیہ کا اعتبار بھی کم ہو جاتا ہے۔ استقراء کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ عام لوگ اسے نہیں سمجھ سکیں گے اور حسن اتفاق دیکھئے کہ بے اعتبار کثیر احتمالات کا فہم و ادراک تفصیل پر موقوف نہیں ہے جیسا کہ بلندی سے انسان کا زمین پر گرنا بھی ثقل و کشش اور اس کے قانونِ جاذبہ کی گتھیوں کو سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ اور آپ کے بھائی کے خط والے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان "اسس المنطقیہ" پڑھے کہ اس کے ذریعہ احتمالات کے ضعیف ہونے کی تشخیص کر سکے جیسا کہ ایک بینک کا ملازم اکاؤنٹنٹ بھی استقراء اور حساب احتمالات کو جانے بغیر عملی طور پر یہی کام انجام دیتا ہے اور جس کے احتمالات زیادہ ہوتے ہیں اسے بے اعتبار تصور کرتا ہے۔

چونکہ چوتھے مرحلہ میں کسی اور کا خط ہونے کا احتمال بہت ضعیف ہے لہٰذا آپ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ خط آپ کے بھائی کا ہی ہے۔

پانچواں مرحلہ: چوتھے مرحلہ میں ترجیح اس بات کو ہے کہ خط آپ کے بھائی کا ہے اور دوسرا احتمال ضعیف ہے جس طرف کو ترجیح زیادہ ہوگی اس کا مقابل اتنا ہی کمزور ہوگا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ خط آپ کے بھائی کا ہے

یہ مثال انسان کے روزمرہ کے حالات کی ہے۔

علمی استدلال کی مثال

جن طریقوں سے دانشور اپنے علمی نظریہ اور اس کے اثبات پر استدلال کرتے ہیں اب ہم انھیں کے طرز استدلال کو پیش کرتے ہیں سائنسدان سیاروں اور متحرک ستاروں کے سرچشموں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان سب ستاروں کا سرچشمہ سورج ہے، یہ دسیوں لاکھ سال پہلے آگ کے شعلے کی طرح اس سے جدا ہوگئے تھے، علم فضاء کے ماہرین اصل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان ٹکڑوں کے سورج سے جدا ہونے کے سبب میں اختلاف رکھتے۔

جس اصل نظریہ پر علم فضا کے ماہرین متفق ہیں اس پر درج ذیل طریقوں سے استدلال کیا جاتا ہے۔

فضائی علوم کے ماہرین نے ٹیلیسکوپ وغیرہ — یعنی حس وتجربہ — کے ذریعہ جن وقوعوں اور مظاہر کا سراغ لگایا ہے وہ اس طرح ہیں:

۱۔ زمین اسی طرح سورج کے گرد گھوم رہی ہے جس طرح وہ اپنے گرد گھوم رہا ہے یعنی اس کی گردش مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے۔

۲۔ اور زمین بھی اپنے گرد ایسے ہی گھوم رہی ہے جیسے سورج اپنے گرد گھوم رہا ہے یعنی اسکی گردش بھی مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے۔

۳۔ جس محور و مدار پر زمین سورج کے گرد گھومتی ہے وہ سورج کے

خط استواء کے موازی ہے اس طرح کہ سُورج کی مثال چکّی کی کیل جیسی ہے اور زمین کی مثال چکّی پر ایک نقطہ کی سی ہے۔

۴۔ جن عناصر سے زمین بنی ہے وہ تقریباً سبھی سورج میں موجود ہیں۔

۵۔ عناصر کی کمیت، زمین اور سورج میں یکساں ہے مثلاً ہائیڈروجن دونوں میں اصلی عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔

۶۔ زمین کی سورج کے گرد گھومنے کی رفتار اور اپنے گرد گھومنے کی رفتار اور سورج کے اپنے گرد گھومنے کی رفتار کے درمیان ایک رابطہ برقرار ہے۔

۷۔ علمی تخمینہ کی رو سے زمین اور سورج کی عمر بھی ایک ہی ہے۔

۸۔ زمین کا اندرونی حصہ گرم ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء میں زمین بہت زیادہ گرم تھی۔

یہ ایسے وقوعے ہیں جن کو سائنسدانوں نے پہلے مرحلہ میں حس و تجربے سمجھا یا محسوس کیا ہے۔

دوسرے مرحلہ میں سائنسدانوں نے ان مظاہر اور وقوعوں کے مجموعے سے ایک فرضیہ قائم کیا ہے چنانچہ اگر یہ فرضیہ واقعاً ثابت ہو تو وہ ان تمام وقوعوں کو بیان کرے گا اور وہ فرضیہ یہ ہے کہ: زمین سورج ہی کا جزو ہے، جو بعض اسباب کی بنا پر اس سے جدا ہوگیا ہے۔ اس فرضیہ کی بنا پر ہم گذشتہ وقوعوں کی تفسیر کر سکتے ہیں۔

۱۔ سورج کے گرد زمین کی گردش، سورج کی اس گردش کے موافق ہے جو وہ

اپنے گرد گردش کر رہا ہے کیونکہ دونوں کی گردش مغرب سے مشرق کی طرف ہے چنانچہ دونوں کی گردش میں ہم آہنگی و توافق ہے اس لئے فرضیہ کا صحیح ہونا واضح ہے۔ کیونکہ اگر کسی گھومنے والے جسم سے کوئی ٹکڑا جدا ہو جائے اور وہ کسی دھاگہ وغیرہ کے ذریعہ اس سے مربوط رہے تو وہ بھی اصل کی گردش کی سمت گردش کرتا ہے۔

۲۔ زمین کا اپنے گرد گھومنا سورج کی اپنے گرد حرکت کے موافق ہے۔ یعنی مغرب سے مشرق کی طرف گھومنے والے جسم سے جدا ہونے والا ٹکڑا بھی قانون استمرار کے تقاضے کے تحت حرکت کر رہا ہے۔

۳۔ اسی طرح حرکت و موازات میں۔

۴ و ۵۔ زمین و سورج کے عناصر میں اتحاد ہے اگرچہ ان دونوں کا مفہوم جدا ہے اور چونکہ زمین سورج ہی کا جزو ہے لہٰذا اجزاء کے عناصر وہی ہیں جو کل کے ہیں۔

۶۔ زمین کی اپنے اور سورج کے گرد اور خود سورج کی اپنے گرد حرکت کی رفتار میں نظم و یکسانیت ہے۔

۷۔ زمین اور سورج کی عمر میں مشابہت کی توجیہ بھی اسی نظریہ سے کی جا سکتی ہے کہ زمین سورج سے جدا ہوئی ہے۔

۸۔ زمین کا اندرونی حصہ گرم ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے زمین گرم ہے۔

تیسرا مرحلہ، اگر ہم یہ فرض کریں کہ زمین کا سورج سے جدا ہونیوالا فرضیہ صحیح نہیں ہے تو اس سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا یہ توسعے یہ مظاہر اور نظم سب اتفاقی امر ہے اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے؟ ان کا کسی قاعدہ

وقانون کے بغیر جمع ہونا بعید از عقل ہے اور اس فرضیہ کو رد اور ان وقوعوں کی تفسیر کرنے کیلئے ہمیں بہت سے فرضیے قائم کرنا پڑیں گے۔

مثلاً سورج کے گرد زمین کی حرکت اور خود اپنے گرد سورج کی حرکت ـــ کہ مغرب سے مشرق کی طرف ہے ـــ میں جو نظم ہے اس کیلئے ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ زمین اس منظومہ شمسی سے بہت دور ایک جرم ہے وہ خواہ جدا گانہ طور پر خلق ہوئی ہو یا کسی اور آگر سورج سے جدا ہوئی ہو اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ زمین آزاد ہونے کے بعد مدار آفتاب میں مغرب کی طرف سے داخل ہوئی اور پھر مشرق کی طرف گردش کرنے لگی اور اگر وہ مدار آفتاب میں مشرق کی سمت سے داخل ہوتی تو اس کی گردش مشرق سے مغرب کی طرف ہوتی۔

اور یہ بھی فرض کرنا ہوگا کہ اپنے گرد زمین کی گردش اور اپنے گرد سورج کی گردش کی باہمی مشابہت اس بنا پر ہے کہ جس سورج سے زمین جدا ہوئی ہے وہ بھی مغرب سے مشرق کی طرف گردش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی سورج کے گرد زمین کی گردش جو خط استوا کے موازی ہے اس کیلئے یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ایک دوسرا سورج جس سے زمین جدا ہوئی ہے وہ خط استواء کی سمت کے عمودی نقطہ پر واقع تھا۔

پھر زمین کے عناصر کی ہم آہنگی اور سیکڑوں عناصر کی نسبت کیلئے یہ فرض کرنا پڑے گا کہ جس آفتاب سے یہ زمین جدا ہوئی ہے اس میں یہی عناصر پائے جاتے ہیں۔

اور اس نظم کی بہ نسبت جو کہ سورج اور خود گردش زمین کی رفتار اور سورج کی اپنے گرد کی رفتار کے بارے میں یہ فرض کرنا ہوگا کہ جس سورج سے زمین جدا ہوئی ہے اسی نے جدا ہونے والی زمین کو وہ حرکت دی ہے جو ہمارے سورج کی رفتار کے موافق تھی۔

اور جو نظم و یکسانیت زمین و سورج کی عمر میں پائی جاتی ہے، اور جو زمین کی حرارت ابتداء ہی سے ہے، اس کے پیش نظر یہ فرض کرنا ہوگا کہ زمین کسی دوسرے سورج سے جدا ہوئی ہے جس کی عمر ہمارے سورج کے برابر ہے اور زمین اس سے اس طرح جدا ہوئی کہ اس میں اتنی ہی گرمی موجود تھی جتنی اس سورج میں ہے۔

اسی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر زمین کے سورج سے جدا ہونے والا فرضیہ صحیح نہیں ہے تو تمام وقوعوں اور مظاہر کو اتفاقی امر فرض کرنا ہوگا جبکہ اس کا احتمال بہت کم ہے در آنحالیکہ صرف اسی سورج سے جدا ہونے والے فرضیہ سے سب کی تفسیر ہو جاتی ہے۔

چوتھے مرحلہ میں یہ کہا جائیگا کہ زمین کے بارے میں ان فرضیوں کا احتمال اس فرض کی بنا پر کہ زمین اس سورج سے جدا نہیں ہوئی، بہت کم ہے اس بنا پر ان فرضیوں کا فی الحال یہ مقتضا ہے کہ زمین اسی سورج سے جدا ہوئی ہے۔

پانچویں مرحلہ کا ربط زمین کے اس سورج سے جدا ہونے اور زمین پر پائے جانے والے مظاہر کے ضعیف احتمال سے ہے جیسا کہ چوتھے مرحلہ میں بیان ہوا ہے کہ زمین سورج سے جدا نہیں ہوئی ہے جیسا کہ مرحلہ سوم میں بیان ہوا ہے چنانچہ تیسرے مرحلہ میں جتنا احتمال ضعیف ہوگا اتنی ہی چوتھے کو ترجیح ہوگی۔ اور اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ زمین سورج ہی سے جدا ہوئی ہے۔ مطالب کے اثبات کیلئے اس طریقہ استدلال کو دانشوروں نے قبول کیا ہے اور مکمل طور پر اس سے مطمئن ہوگئے ہیں۔

اس طریقے سے ہم

وجودِ صانع کے اثبات پر کیسے استدلال کر سکتے ہیں؟

اس علمی و عام طریقہ کو بیان کرنے کے بعد جو کہ احتمالات کی بنیاد پر قائم ہے اور دلیل استقراء سے اور گذشتہ تطبیق کے دوران اس کی اہمیت بھی معلوم ہو چکی ہے ۔ اب ہم اثبات صانع پر اسی طریقہ سے استدلال کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں بیان شدہ طریقوں کو اختیار کرتے ہیں :

الف ۔ طبیعت کے نظام یافتہ مظاہر اور ایک زندہ موجود کی حیثیت سے انسان کی ضرورت کے درمیان اتفاق و سازگاری ہے جس سے انسان کو زندہ رہنے کا امکان میسر ہے اور یہ سازگاری کچھ ایسی ہے کہ اگر ان میں سے کسی نظام میں تغیر ہو تو انسان کی زندگی دشوار ہو جائے بلکہ وہ فنا ہو جائے ۔ ذیل میں ان کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں :

سورج سے جو حرارت زمین کو ملتی ہے وہ ان زندہ موجودات کیلئے کافی ہے ، کم ہے نہ زیادہ اور علمی تخمینہ کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اس درجۂ حرارت کے مطابق ہے کہ جس میں زمین کے زندہ موجودات زندگی بسر کر سکتے ہیں ۔

اس اعتبار سے اگر یہ فاصلہ زیادہ ہوتا تو زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری حرارت زمین پر نہیں پہنچ سکتی تھی اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو حرارت اس سے بڑھ جاتی اور وہ برداشت سے باہر ہو جاتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زمین اور اس کو محیط فضاء متعدد اجزاء سے مرکب ہے۔ اس میں آکسیجن کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ دنیا کے پانی میں ۸/۱۰ آکسیجن ہے اور مادہ میں آکسیجن کی کثرت کی وجہ سے اس سے ایک جزء جدا ہو گیا جو ہوا بنانے میں بہت مؤثر ہے یہ آکسیجن زندگی کی ضروریات کا جزء ہے کیونکہ تمام زندہ موجودات — جیسے، انسان و حیوان — کو سانس لینے کیلئے آکسیجن کی اشد ضرورت ہے چنانچہ اگر آکسیجن بھی اتنی ہی ہوتی جس قدر دوسرے ترکیبی مواد ہیں تو زندگی محال ہو جاتی۔

آپ آکسیجن کے جدا ہونے والے جزء اور انسان کی ساری ضرورتوں کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ کس طرح اس کی ضرورتوں کو کامل کرتا ہے اور اسے عملی زندگی دیتا ہے۔ ہوا میں ۲۱ جزء آکسیجن اور ۷۹ جزء دوسری گیسیں ہیں، اگر اس سے زیادہ آکسیجن ہوتی تو روئے زمین پر ہمیشہ آگ بھڑکتی رہتی اور اگر مذکورہ مقدار سے کم ہوتی تو زندگی دشوار ہو جاتی اور انسان کو ضرورت بھر حرارت حاصل کرنے کے لئے آگ نہ مل پاتی۔

یہی طبعی نظام لاکھوں کروڑوں بار دہرایا گیا ہے اور ہر دور میں آکسیجن کی مقدار محفوظ رہتی ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے۔ انسان و حیوان سانس لیتے وقت آکسیجن لیتے ہیں اور اسے خون میں جذب کرتے ہیں اور سارے بدن میں پہونچاتے ہیں، یہی آکسیجن کھانے کو جلد ہضم کرتی ہے اور اس سے کاربونک ایسڈ پیدا ہوتی ہے۔ اس گیس کو پھر انسان باہر نکال دیتا ہے

ہر ایک فیزیالوجی کے اعتبار اور طبیعت کے دیگر قوتوں سے ارتباط کی وجہ سے زندگی اور زندگی کو جاری رکھنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں۔

مثلاً جو مظاہر بہترین طریقہ سے دیکھنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں۔ آنکھ کا عدسہ۔ LENS۔ عکس کو آنکھ کے پردہ (شبکہ) پر پھینکتا ہے۔ آنکھ کا لینز LENS شبکہ (پردہ) پر چیزوں کی تصویر منعکس کرتا ہے۔ خود یہ پردہ سات تہوں پر مشتمل ہے اور اس کی آخری تہہ استوانہ اور مخروطی شکل کی لاکھوں خلیوں پر مشتمل ہے جو آپس میں ایک منظم صورت میں مرتبط ہیں اور ان خلیوں کا مجموعہ آنکھ کے لینز سے اس طرح مرتبط ہے کہ ایک چیز کو دیکھنے کے وقت "دو چیزیں" نظر آتی ہیں۔ یعنی ایک چیز جو واقعی باہر موجود ہے اور دوسری اس چیز کی تصویر جو پردہ پر الٹی پڑتی ہے۔ لیکن دیکھنا اس مرحلہ سے مربوط نہیں ہے بلکہ لاکھوں دیگر عصبی خلیے اس پردے پر پڑی الٹی تصویر کو الٹا (یعنی طبیعی) کرنے کا کام انجام دیتے ہیں اور اسے حیوان کے دماغ تک منتقل کرتی ہیں اور اس مرحلہ پر دیکھنے کا عمل وجود میں آتا ہے کہ یہ عمل حیوانات کی زندگی کو آسان بنانے میں خاص کردار ادا کرتا ہے۔

یہاں تک کہ مظاہر میں جو حسن و خوبصورتی اور خوشبو ہے وہ بھی دیکھنے میں مدد کرتے ہیں اور اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ مثلاً پھول، کلیاں اپنی زیبائی اور رنگوں کے ذریعہ حشرات کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تاکہ پیوند اور حمل کا کام انجام پذیر ہو جائے۔

اور عام طور پر زوجیت کا عمل اور فزیالوجی کے نقطۂ نظر سے مرد و عورت کے آلۂ تناسل میں مکمل تطابق اور حیوانات و نباتات کا اس طرح ہونا کہ جو زندگی کے دوام کا اور طبیعی فعل و انفعالات کا ضامن ہے اور موجودات کی زندگی کو بھی آسان کرتا ہے۔

وان تعدّوا نعمة الله لا تحصوها انّ الله لغفور رحیم (النحل/۱۸)

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے بیشک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

ب۔ ان طبیعی وقوعوں میں یہ دائمی ارتباطات جو لاکھوں حالات میں زندگی کا تحفظ کرتے ہیں اور زندگی کو آسان بناتے ہیں، اس کی توجیہ اسی فرضیہ سے کی جا سکتی ہے کہ اس ہستی کو بنانے والا ایک حکمت والا ہے اور موجودات کی خلقت کا ایک مقصد ہے اور اس فرضیہ سے ان تمام ارتباطات و موجودات کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔

ج۔ فرض کیجئے کہ صانع حکیم والا فرضیہ درحقیقت ثابت نہیں ہے تو ان تمام طبیعی وقوعوں کے توافق و ارتباطات کے بارے میں جو زندگی کو آسان بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں بے مقصد ہیں، کتنے احتمال دیں گے؟ واضح ہے کہ ان سب کے بے مقصد ہونے کے فرضیہ اور گذشتہ مثال میں ان تمام صفات و موارد کی مشابہت کے باوجود آپ کے بھائی کا خط نہیں ہے۔ یہ سب

کچھ بہت بعید ہے کیونکہ ہزاروں صفت میں مشابہ ہونے والا فرضیہ (احتمالات کے اعتبار سے) بہت ضعیف ہے۔ پھر ہم یہ کیسے فرض کر سکتے ہیں کہ جس زمین پر ہم زندگی گذار رہے ہیں اس کے تمام قوانین و نظام بے شعور مادہ کی پیداوار ہیں جبکہ اس میں لاکھوں علامتیں ایسی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کو پیدا کرنے والا بامقصد اور حکمت والا ہے۔

د۔ لہٰذا ہم کسی شک و تردید کے بغیر دوسرے مرحلہ میں پیش کئے جانے والے فرضیہ کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہ فرضیہ صحیح ہے یعنی اس جہان کا پیدا کرنے والا حکمت والا ہے۔

۵۔ ہم توحید والے فرضیہ اور ان گھٹتے ہوئے احتمال کے درمیان ایک باریک رابطہ محسوس کرتے ہیں جو کہ تیسرے مرحلہ میں بیان ہوا ہے مسلسل حوادث و اتفاقات کی بنا پر تیسرے مرحلے کا احتمال بہت زیادہ ضعیف ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ فرضیہ علمی قوانین کے تحت ان وقوعوں کے اچانک اور اتفاقی ہونے کو نہیں بیان کر سکتا، پس یہ احتمالی فرضیہ قابل اعتماد نہ ہوگا۔ بلکہ وجود صانع والے فرضیہ کا احتمال قوی ہوجاتا ہے جو کہ ساری کائنات و آیات توحیدی کی قطعی دلالتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کو پیدا کرنے والا حکمت والا ہے اور اس چیز پر کائنات کا ذرہ ذرہ دلالت کر رہا ہے۔

"ہم عنقریب اپنی آیتوں کو تمام اطرافِ عالم میں اور خود ان کے اندر دکھلائیں گے تاکہ ان پر واضح ہوجائے کہ وہ حق ہے اور پروردگار کیلئے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔"
(فصلت/۵۳)

"بے شک زمین و آسمان کے پیدا کرنے اور رات دن کے آنے جانے اور ان کشتیوں میں جو کہ دریا میں چلتی ہیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل کیا ہے اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا ہے اور اس ــــ زمین ــــ میں ہر قسم کے چوپائے لبسانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور زمین و آسمان کے درمیان مسخر کئے جانے والے بادلوں میں صاحبانِ عقل کے لئے اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔"
(بقرہ/۱۶۴)

"پھر دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھو کہیں کوئی شگاف نظر آتا ہے اس کے بعد بار بار نگاہ ڈالو دیکھو نگاہ تھک کر لوٹ آئیگی لیکن کوئی عیب نظر نہیں آئے گا۔"
(ملک/۵)

دلیلِ فلسفی

وجودِ خدا پر دلیلِ فلسفی کے معنی :

اثباتِ صانع پر دلیلِ فلسفی والی بحث کو شروع کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم یہ بتادیں کہ دلیلِ فلسفی کیا ہے ؟ اس کے اور دلیلِ علمی کے درمیان کیا فرق ہے اور دلیل کی کتنی قسمیں ہیں ؟

دلیل کی قسمیں :

دلیل کی تین قسمیں ہیں : ۱۔ دلیلِ ریاضی ۲۔ دلیلِ علمی ۳۔ دلیلِ فلسفی

دلیلِ ریاضی : دلیلِ ریاضی وہ دلیل ہے جو ریاضیات اور منطقِ صوری کے میدان میں کام آتی ہے۔ یہ دلیل ہمیشہ اصل عدمِ تناقض، یعنی تناقض محال ہے پر قائم ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ "الف" وہی "الف" ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ "الف"، "الف" نہ ہو اور جو دلیل بھی عدمِ تناقض پر استوار ہوتی ہے اسے دلیلِ ریاضی کہتے ہیں اور اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

دلیلِ علمی : یہ دلیل علومِ طبیعیہ میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ دلیل ان معلومات پر مستند ہوتی ہے جو کہ حسی یا علمی استقراء کے ذریعہ دلیلِ ریاضی کے مبادی کے پیشِ نظر ثابت ہوتے ہیں۔

دلیلِ فلسفی : یہ دلیل معلوماتِ عقلیہ کی مدد سے عالمِ خارج میں کسی امر کو ثابت کرتی ہے ۔ معلوماتِ عقلیہ وہ معلومات ہیں جن میں حس و تجربہ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اور یہ مبادی دلیلِ ریاضی کے پیشِ نظر عمل کرتی ہے۔ البتہ یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ دلیلِ فلسفی حسی اور استقرائی معلومات کا سہارا نہیں لیتی ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ صرف حسی معلومات پر اکتفا نہیں کرتی ہے بلکہ اس اعتماد کے پہلو بہ پہلو یا مستقل طور پر اس سے علیحدہ

ہو کر معلوماتِ عقلیہ پر تکیہ کرتی ہے اور پھر کسی قضیہ کا اثبات کرتی ہے۔

پس دلیل فلسفی اور دلیل علمی کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ دلیل فلسفی مبادئ دلیل ریاضی کے قلمرو سے باہر بھی پائی جاتی ہے یعنی دلیل ریاضی سے اعم ہے۔

دلیل فلسفی کا جو مفہوم ہم نے پیش کیا ہے اس کی رُو سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا معلوماتِ عقلیہ پر ۔ جو کہ حس و استقراء کے بغیر عقل کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں ۔ اعتماد کیا جا سکتا ہے ؟

اس کا جواب مثبت ہے کیونکہ بعض عقلی معلومات جن کو سبھی قبول کرتے ہیں جیسے عدمِ تناقض کہ جس پر سارے ریاضیات کی بنیاد استوار ہے، عقل کی اساس پر ہمارے لئے روشن و واضح ہے نہ کہ حس و تجربہ اور مشاہد کے ذریعہ استقرائی دائرہ میں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اصل عدم تناقض کے سلسلہ میں ہمارا اعتقاد تجربہ و شواہد سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔ اپنی بات کو واضح کرنے کیلئے ہم ریاضی کا ایک فارمولہ پیش کرتے ہیں ۴ = ۲×۲ ۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ سادہ ریاضی کا فارمولہ صحیح ہے ۔ شواہد کے ذریعہ اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ اگر کوئی اسے رد کرنے کے لئے شواہد پیش کرے گا تو ہم اس کی بات پر کان بھی نہیں دھریں گے اور کبھی بھی اس بات کی تصدیق نہیں کریں گے کہ ۳ = ۲×۲ یا ۵ = ۲×۲ ہوتے ہیں یہ ۴ = ۲×۲ کے سلسلہ میں جو ہمارا اعتقاد ہے اس کا حس و تجربہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ اثبات و نفی کی دلیل سے ضرور متاثر ہوتا۔

اب جبکہ ہم اس حقیقت پر اس قدر اطمینان و اعتماد رکھتے ہیں، باوجودیکہ اس فارمولہ کا احساس و تجربہ سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ان عقلی معلومات پر اعتماد ممکن ہے جو کہ فلسفی دلیل پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔

بعبارت دیگر دلیل فلسفی کو ہم محض اس لئے رد کر دیں کہ اس کی بنیاد عقلی معلومات ہیں اور تجربہ و استقراء سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم دلیل ریاضی کو ٹھکرادیں کیونکہ اس کی اساس اصل عدم تناقض پر ہے اور تجربہ واستقراد سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

اثباتِ صانع پر دلیل فلسفی کے چند نمونے

یہ دلیل درج ذیل تین قضیوں پر مبنی ہے :

۱۔ ہر حادثہ کا کوئی سبب ہوتا ہے جس سے وہ وجود میں آتا ہے۔ اس قضیہ کو انسان فطری شعور سے سمجھ لیتا ہے اور استقراد علمی ہمیشہ اس کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ جس موجود میں بھی کمال و نقص کے لحاظ سے درجات پائے جاتے ہیں اس میں ناقص درجہ کامل درجہ کا سبب نہیں بن سکتا ہے اور نہ ہی نچلا درجہ، بلند درجہ کا سبب قرار پاسکتا ہے۔ حرارت کے درجات ہیں، اسی طرح شناخت و معرفت کے بھی درجات ہیں اسی طرح نور کے بھی درجات ہیں بعض بعض سے بہت شدید ہے۔ کم درجہ کی حرارت درجۂ بالا کیلئے سبب نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی شخص ایسے آدمی سے پوری انگریزی سیکھ سکتا ہے جو انگریزی کی تھوڑی سی سد بدھ رکھتا ہے یا بالکل نہیں

جانتا۔ اور نہ کم درجہ کا نور بڑے درجہ کا نور لا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر کمال اور بلند درجہ زیادہ نور وکمال رکھتا ہے جو کہ نچلے درجہ والے کے پاس نہیں ہوتا اور کم والا دوسرے کو نہیں دے سکتا جو خود ہی تہی دامن ہے وہ دوسرے کو کیا دے سکتا ہے۔

۳۔ مادہ اپنے مستقل ارتقاء یا انقلاب کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا، ان صورتوں کے بھی درجات ہوتے ہیں مثلاً خالص پانی کا قطرہ وجود مادہ کی ایک صورت ہے جسمیں حس اور جان نہیں ہے اور اس سے بلند و بالا صورت "پرد ٹوپلازم" ہے کہ نباتی اور حیوانی مادہ ہے۔ امیبا (AMOEBA) ایک خلیہ والا جانور ہے جو خورد بین ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مادہ کی ترقی کی دوسری شکل ہے۔ اور یہ زندہ، حساس و مفکر انسان اس عالم کے موجودات کی اعلیٰ قسم ہے۔

مادہ کی گوناگوں صورتوں اور شکلوں کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان صورتوں اور شکلوں کے درمیان کیا کمّی و عددی فرق ہے؟ یعنی ایک صورت میں زیادہ عناصر ہیں اور دوسری صورت میں کم عناصر ہیں اور ان کے درمیان میکانیکی ربط ہے یا ان کے درمیان نوعی و کیفی فرق ہے؟ یعنی ارتقاء و تکامل سے موجودات متفاوت ہو جاتے ہیں۔

بعبارت دیگر انسان اور اس خاک کے درمیان ۔ جس سے وہ وجود میں آیا ہے ۔ صرف کمّی یا مقداری فرق ہے یا ارتقاء و تکامل کے درمیان فارق ہے جیسے کم اور شدید روشنی کے درمیان فرق۔

جس زمانہ سے انسان کے سامنے یہ سوال آیا ہے اسی وقت سے اس کی فطرت نے

گواہی دی ہے کہ یہ گوناگوں شکلیں وجود کے درجات اور تکامل کے مراحل کی وجہ سے ہیں۔اس لحاظ سے حیات، مادہ کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہ درجہ محدود نہیں ہے بلکہ اس کے بھی درجات ہیں۔جب بھی حیات نیا مفہوم اختیار کرتی ہے، بڑا درجہ شمار ہوتا ہے اس اعتبار سے ایک زندہ موجود جو کہ حس و فکر کا حامل ہے ، درجۂ نبات سے بڑا اور غنی ہے ۔

کائنات کی مادی تفسیر

سو سال سے بھی پہلے مادی مفکرین نے اس کی مخالفت کی اور اس سے بچنے کیلئے انہوں نے کائنات کی میکانیکی طریقہ سے تفسیر کی اور کہا : خارج میں جو دنیا ہے یہ چھوٹے چھوٹے مماثل و یکساں اجسام سے بنی ہے ان اجسام پر عام قوانین جیسے قوت جاذبہ و دافعہ اثر انداز ہوئے اور اجزاء عالم کی جمع و تفریق کی بنا پر مادہ مختلف صورتوں میں ڈھل گیا ہے اس بنیاد پر مادہ پرستوں نے اجسام کی حرکت اور فضا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو میکانیکی طریقہ میں منحصر جانا ہے اور مادہ کی گوناگوں صورتوں کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اجسام کے جمع ہونے اور متفرق ہونے کی متعدد راہیں ہیں۔ان میں اور کسی چیز کا دخل نہیں ہے۔مادہ پرستوں کے لحاظ سے مادہ خود اپنے وجود میں نمو نہیں کرتا ہے اور نہ اس میں ارتقا ہے بلکہ یہ ذرات کی گوناگوں صورتوں کی جمع و تفریق ہے ، بالکل ایسے ہی جیسے موم کا ٹکڑا کہ اسے مختلف صورتوں میں ڈھالا جا سکتا ہے خود اس میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوگا وہ موم ہی رہے گا۔

یہ فرضیہ علم میکانیکی یا علوم طبیعی میں سے اولین علم کی پیداوار ہے۔اسی فرضیے کا اس ارتقاء

شروع ہوا ہے پھر اس سے علمی طریقوں سے بحث کی جانے لگی۔ چنانچہ اجسام کی عام حرکت میں میکانیکی حرکت اور فضا میں ستاروں کی حرکت اس کے اسباب کو ظاہر کرتی ہے۔

کائنات کی میکانیکی تفسیر نہیں کی جا سکتی

علم کی مسلسل ترقی اور دیگر میدانوں میں علمی بحث کے بڑھتے ہوئے طریقوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ فرضیہ غلط ہے اور یہ تمام حرکتوں کی تفسیر کرنے سے قاصر ہے اور دوسری طرف یہ ثابت کیا کہ یہ فرضیہ اجسام کے ضمن میں مادہ کی مختلف شکلوں اور ان کی نقل و حرکت کی میکانیکی تفسیر نہیں کر سکتا۔ علم نے بھی فطرت انسان کی اس سلسلہ میں تصدیق کی ہے کہ مادہ کی گوناگوں شکلیں بھی نقل و انتقال سے مربوط نہیں ہیں بلکہ یہ تحول نوعی اور تنوع کیفی ہے اور علمی تجربات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عناصر کی عددی ترکیب سے حیات، احساس اور فکر وجود میں نہیں آ سکتی بلکہ فکر و احساس مادہ کی ترقی و تکامل کا نتیجہ ہے خواہ اس ارتقاء و تحول کا محتوی مادی ہو یا مادی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں تین قضیے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ہر وقوعہ سبب کا محتاج ہے

۲۔ ادنیٰ اپنے سے بڑے کے لئے سبب نہیں بن سکتا۔

۳۔ اس کائنات میں درجاتِ وجود میں اختلاف اور اشکال کا گوناگوں ہونا کیفی لحاظ سے ہے۔ ان تین قضیوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جہانِ ہستی میں گوناگوں صورتیں اور متنوع شکلیں مادہ کے نمو اور اس کے تکامل کی بناپر ہیں۔ تو ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مادہ میں یہ اضافہ کہاں سے ہوا ہے اور اس کا سبب کیا

کیا تم نے اس دانہ کو دیکھا ہے جو زمین میں بوتے ہو، اسے تم اگاتے ہو یا اس کے اگانے والے ہم ہیں ؟

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ. (واقعہ / ۷۱ - ۷۲)

کیا تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے لکڑی سے نکالتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟

وَمِنْ ءَايَـٰتِهِۦٓ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَآ أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ (روم / ۲۰)

"اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں خاک سے پیدا کیا ہے اور اس کے بعد تم بشر کی صورت میں پھیل گئے۔"

اس دلیل کے مقابلہ میں مادہ پرستوں کا موقف

اب ہم اس دلیل کے مقابلہ میں مادہ پرستوں کا موقف بیان کرتے ہیں۔

قدیم وجدید مادہ پرستوں کے نظریہ میں اختلاف ہے جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قدیم مادہ پرست اس بات کے قائل تھے کہ جہانِ ہستی میں میکانکی حرکت ہے وہ حیات واحساس اور فکر کو مادہ کی جمع و تفریق کی مختلف صورت سمجھتے تھے۔ مادہ سے کوئی نئی چیز وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ لیکن نئے مادہ پرست جہان ہستی میں نوعی و کیفی تکامل وارتقاء کے قائل ہیں۔ انہوں نے دوسرے طریقہ سے اس کی تفسیر کی ہے

اور دوسرے فرقہ نے بیر مادہ پر اکتفاء کرنے کو جمع کیا ہے ۔ یعنی خود مادہ کو تمام کیفی و نوعی تحولات کا مصدر جانا ہے، مثلاً ادنیٰ شئے بلند و اعلیٰ شئے کا سبب ہوتی ہے، لیکن خارج سے نہیں بلکہ اندر ہی سے، یہ اسی گزشتہ مثال کی طرح ہے کہ ایک فقیر سرمایہ داری کے منصوبے بنائے ۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ کے تمام گوناگوں تحولات اور ارتقا کا سرچشمہ خود مادہ کے اندر ہے جیسے چوزہ مرغی کے انڈے میں موجود ہے اور پانی میں گیس موجود ہے ۔

لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں مادہ انڈا بھی ہو اور مرغ بھی، پانی بھی ہو اور گیس بھی، اس کا جواب وہ مادی جدلیت کی طرف سے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ تناقض ہے اور تناقض طبیعت کا عام قانون ہے ۔ ہر چیز کی ضد و نقیض اس کے اندر موجود ہے اور وہ اپنی نقیض سے مسلسل برسرپیکار رہتی ہے اور دو نقیضوں کے ٹکراؤ سے مادہ میں ایک انقلاب آتا ہے جیسے انڈا معین وقت پر پھٹتا ہے اور اس کے اندر سے چوزہ نکل آتا ہے ۔ اسی طرح مادہ مسلسل ترقی کر رہا ہے کیونکہ مادہ کے اندر سے پیدا ہونے والی نقیض کے بعد بھی اس ٹکراؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس سے دوسری نقیض وجود میں آتی ہے اور اس طرح مادہ ترقی کرتا رہتا ہے ۔

اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس جملے سے کہ "ہر چیز کے اندر اس کی نقیض موجود ہے ۔" نئے مادہ پرستوں کی مراد کیا ہے ؟ اور درج ذیل معنی سے ان کی مراد کیا ہے ۔ کیا انڈا اور چوزہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں ؟

ا۔ کیا ان کی مراد یہ ہے کہ انڈا چوزہ کو وجود دیتا ہے اور اسے صفات حیات دیتا ہے یعنی بے جان چیز سے جاندار وجود میں آتا ہے ؟ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے

فلاش سرمایہ کاری کرے جبکہ یہ بات گذشتہ بدیہی چیزوں کے خلاف ہے۔

۲۔ یا ان کی مراد یہ ہے کہ انڈا چوزہ کو وجود نہیں دیتا ہے بلکہ وہ انڈے کے اندر ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ہر چیز کی نقیض بھی اس کے اندر موجود ہو، پس جس وقت انڈا ہوتا ہے اسی وقت وہ چوزہ بھی ہوتا ہے بالکل اس صورت کی مانند جو ایک طرف سے ایک شکل میں اور دوسری طرف دوسرے انداز میں نظر آتی ہے۔

واضح ہے کہ جب ایک وقت میں انڈا چوزہ ہوگا تو پھر کوئی تکامل اور نمو بھی نہیں ہوگا کیونکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے ایک شخص اپنے جیب سے کچھ سکے نکالے، اس کام سے اس پونجی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا کیونکہ جو پونجی اب اس کے ہاتھ میں ہے وہ پہلے اسکی جیب میں تھی اس میں تکامل و نمو نہیں ہے حالانکہ انڈے کے اندر سے ایک نئی چیز چوزہ کی شکل میں نکلتی ہے تو اس صورت میں ہمیں اس بات کا قائل ہونا پڑے گا کہ انڈا چوزہ نہیں ہے اور ایک ہی زمانہ میں انڈا بھی ہو اور چوزہ بھی یہ نہیں ہو سکتا بلکہ انڈا وہ چیز ہے کہ جس کے اندر چوزہ بننے کی صلاحیت ہے۔ اور انڈے کی صورت کے پتھر اور انڈے کے درمیان یہ فرق ہے کہ پتھر میں چوزہ بننے کی صلاحیت نہیں ہے جبکہ انڈے میں مخصوص شرائط کے ساتھ چوزہ بننے کی صلاحیت ہے، ہاں، امکان اور وقوع کے درمیان ایک فرق ہے صرف امکان ہی کافی نہیں ہے جو اس کے معنی کی وضاحت کر سکے۔

جدید علم اور مادی تفسیر کے درمیان تنافی

دوسری طرف اگر مادہ کی مختلف شکلیں اس کے داخلی تناقضات کا نتیجہ ہیں تو ضروری

ہے کہ ان مختلف شکلوں کی تفسیر ان ہی داخلی تناقضات کی اساس پر ہونی چاہئے مثلاً انڈے میں خاص قسم کے تناقضات ہیں جو پانی کے تناقضات سے مختلف ہیں لہٰذا انڈے کے اندر کے تناقضات سے چوزہ اور پانی سے گیس وجود میں آتی ہے۔ اس فرضیے سے مادہ کی مختلف صورتوں کے بعد کے مراحل سے ان اجسام کے بارے میں جو خود اساسی اعداد رکھتے ہیں (یعنی پروٹون، نیوٹرون اور الیکٹرون) تشکیل دیتے ہیں بحث وتحقیق کی جا سکتی ہے۔ کیا ان مواد کے درمیان پایا جانے والا داخلی تضاد ان شکلوں میں سے کوئی مخصوص شکل قبول کرتا ہے؟ مثلاً پروٹون جو مادہ کے تشکیل میں موجود ہے۔ کیا وہ بھی انڈے کی مانند ہے اور دوسرے پروٹون کو جنم دیتا ہے؟ حالانکہ گوناگوں صورتوں کے فرضیہ کو مختلف داخلی نظام کی پیداوار ہونا چاہئے جبکہ جدید علم کہتا ہے کہ مادہ ایک ہے یعنی مادہ کا محتویٰ ایک ہے اور یہ صورتیں مادہ کے مختلف حالات کا نتیجہ ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ پروٹون نیوٹرون اور نیوٹرون، پروٹون میں بدل جائے۔ اس بات کو انڈے کا مرغ بن جانا بخوبی واضح کرتا ہے۔ مثلاً صورتوں کے تنوع کے لئے چند انڈے لیں، داخلی تناقضات کے فرضیہ کے لحاظ سے اسے ترکیب کے لحاظ سے مغائر ہونا چاہئے جیسے پرندہ کے انڈے اور مرغ کے انڈے سے دو مختلف شکل کے چوزے نکلتے ہیں یعنی مرغ کا انڈا چوزے میں اور کبوتر کا انڈا کبوتر میں بدل جاتا ہے۔

لیکن جب ہم مرغی کے دو انڈے مرغی کے نیچے رکھتے ہیں تو اس وقت ان کا داخلی تناقض ان کے اختلاف کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اور جدید علم

کی یہ تاکید کہ کائنات ایک مادہ سے وجود میں آئی ہے۔ ڈائلکٹک اور درونی تناقض سے کوئی ہم آہنگی نہیں رکھتی ہے۔

۳۔ بایں کہ جدید مادہ پرستوں کا مقصد یہ ہے کہ مرغی کا انڈا دو مستقل نقیضوں اور اور دو ضدوں سے گذرتا ہے، یعنی پہلی ضد سے گذرتا ہے پھر دوسری ضد سے، پھر دو ضدوں میں سے ایک مادہ میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسری چھلکے میں رہ جاتی ہے اور اس کشمکش کے نتیجہ میں ایک غالب آجاتی ہے اور نطفہ چوزہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اضداد کے درمیان ایسی جنگیں ہوتی رہتی ہیں یہ متداول اور مانوس ہیں، تصورات عادی میں بھی اور تصورات فلسفی میں بھی لیکن ہم اس تفاعل کو، جو نطفہ اور اس طبیعی مواد کے درمیان ہوتا ہے کہ جس سے مرغ بنتا ہے، تناقض ہی کا نام کیوں دیں اور اسی طرح دانہ اور زمین کے درمیان جو فعل و انفعال ہے، اسے تناقض ہی کیوں کہا جائے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ کہا جائے کہ ایک دوسرے سے متحد ہوگئے ہیں اور اگر بالفرض اسے تناقض کا نام دیدیا جائے تو بھی اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے یعنی وہی تکامل و نمو کا عمل انجام پائے گا اور تکاملی حرکت میں نیا اضافہ اپنی جگہ باقی ہے۔ پھر بھی ہمارے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ یہ اضافہ کہاں سے آیا ہے۔ خود ضد میں یہ چیز نہیں تھی اور دوسرے قضیہ کے خلاف ہے کیونکہ فاقد الشیء معطی شیء نہیں ہوسکتی۔

اس سے قطع نظر کیا طبیعت میں ہمیں کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے کہ جس میں اضداد کی کشمکش رشد و نمو کا حقیقی عامل ہو اس کے برخلاف کشمکش اور تضاد

نقص کا سبب ہے یعنی اس سے مقابلہ والی طاقت گھٹ جاتی ہے اور دوسری طاقت کا اضافہ
نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر اضداد کے درمیان کی کشمکش نمو و تکامل کی اساس ہے جیسا کہ انڈے
اور مرغ کے بارے میں کہا جاتا ہے تو پھر وہ اضافہ اور نمو کہاں ہے جو کہ پانی اور گیس کی
کشمکش سے دوبارہ پانی بن جاتے میں تھا دہاں تکامل کیوں نہیں ہے ؟

طبیعی حوادث اس بات کو روشن کرتے ہیں کہ اضداد کا ٹکراؤ تکامل کا سبب نہیں
بنتا ہے بلکہ کبھی دو ضدوں کے نابود ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً پروٹون جو کہ مثبت طاقت کے حامل ہوتے ہیں اور وہ الیکٹرون جو کہ منفی
طاقت رکھتے ہیں ان کے ذرات کا ایک حصہ ٹکراؤ یا رگڑ سے ختم ہو جاتا ہے تب
فضا میں روشنی پھیلتی ہے یا کوئی چیز چلتی ہے۔

مختصر یہ کہ مادہ خارج سے مدد حاصل کئے بغیر نمو نہیں کر سکتا اور مادہ کے
ایک صورت سے بہتر صورت اختیار کرنے کے سلسلہ میں ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں
کہ مادہ میں چونکہ رشد و نمو ہے اس لئے وہ حیات، احساس اور فکر کی منزل تک
پہنچنے میں اس پروردگار کا محتاج ہے جو ان خصوصیات و امتیازات کا مالک ہے
اور ان سے مادہ کو نواز سکتا ہے۔ مادہ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ نمو کیلئے تگ و
دو کرے وہ صرف تیاری اور آمادگی کر سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک
طالب علم استاد کے سبق کو سمجھنے کے لئے آمادہ ہے وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے
استاد سے حاصل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے صفات

جب ہم اس بات کے متعلق آگاہ ہو گئے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کی پرورش کرنے والا خدا ہے جو کہ حکمت والا اور علم والا ہے تو واضح ہے کہ اسکی ایجاد و کرشمہ سازی اس کے صفات کی معرفت حاصل کریں اور اس کی مخلوقات کے ذریعہ اس کی عظمت کا سراغ لگائیں۔ جیسا کہ ہم ایک انجنئر کی قدر و قیمت کو اس کی بنائی ہوئی عمارتوں سے سمجھتے ہیں اور کسی مولف کی قدر و قیمت کا اندازہ اسکی تألیف سے لگاتے ہیں اور کسی مربّی کو اس کے تربیت کردہ افراد کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اسی طریقے سے ہم اس عظیم کائنات کے پیدا کرنے والے کے صفات یعنی اس کے علم، حکمت، حیات اور اس کے سمیع و بصیر ہونے کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کائنات میں اس کی ایجاد اور نظام میں جو ریزہ کاری ہے اس سے اس کے موجد کے علم و حکمت کا پتہ چلتا ہے اور ذرہ کے سینہ میں جو تب و تاب ہے وہ اسکی قدرت کا واضح ثبوت ہے اور موجودات میں جو عقلی و حسی ادراک کے درجے اور زندگی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا پیدا کرنیوالا بھی حیات و ادراک سے مالامال ہے اور کائنات میں جو ہمآہنگی پائی جاتی ہے

وہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے۔

عدل و استقامت

ہم میں سے ہر ایک ــ اپنی فطری عقل سے ــ افعال کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ عدل حق ہے اور اچھا ہے، ظلم باطل ہے اور شر ہے جو عدل سے کام لیتا ہے وہ قابل احترام ہے اور اسے اجر و ثواب ملنا چاہیئے اور جو ظلم و زیادتی کرتا ہے وہ ذلیل ہے اور اسے سزا ملنی چاہیئے اور یہ قدر و قیمت اس استقراء اور فطرت کے مطابق ہے کہ اگر جہالت اور مفاد پرستی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں تو وہ سچ کو جھوٹ پر اور امانت کو خیانت پر ترجیح دیتی ہے، یعنی اگر آدمی شخصی اغراض، شیطانی وسوسوں اور ظلم و خیانت سے پاک ہو تو صدق و امانت اور عدالت کا راستہ اختیار کرتا ہے اگر ہم اس قانون کو ذاتِ احدیت پر تطبیق کریں۔ جو کہ صفات کمال کا مالک ہے جس کی قدرت لامحدود ہے اور جو کسی کا محتاج نہیں ہے تو ہماری عقل اور ہمارا ضمیر یہی کہے گا کہ وہ عادل ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے۔

اور یہی عقل و فطرت ہمیں، عدالت، استقامت، صداقت اور وفا جیسے نیک صفات کی طرف بلاتی ہے اور ان کے مخالف صفات، جھوٹ اور بے وفائی سے روکتی ہے اور نیک صفات کے لئے نیک جزا اور ناپسندیدہ صفات پہ سزا کا تقاضا کرتی ہے یا یہ کہتی ہے کہ عادل و امین آدمی جس نے عدالت

وامانت داری کے سلسلہ میں فداکاری کی ہے۔ اجر و ثواب کا مستحق ہے اور ظالم و سرکش سے باز پرس ہونی چاہیئے اور اسے سزا ملنی چاہیئے۔

قیامت کے دن جزاء

جب ہم اس بات کے معتقد ہو گئے کہ خدا عادل ہے اس کے کام عدالت کی بنیاد پر انجام پذیر ہوتے ہیں اور وہ مناسب جزاء و سزا دینے پر قادر ہے اور اس سلسلہ میں اس کے حکم کو کوئی نہیں روک سکتا ہے تو واضح ہے کہ خدائے عادل نیک اعمال انجام دینے والوں کو جزاء دینے پر قادر ہے لہٰذا وہ انھیں جزاء دے گا اور ظالم سے مظلوم کا انتقام لے گا۔

باوجودیکہ خدا عادل و قادر ہے لیکن اس دنیا میں بہت سے اعمال کی نہ جزا دیتا ہے نہ سزا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے حق و عدالت کے سلسلہ میں فداکاری کی لیکن اس دنیا میں انھیں ان کے اس نیک کام کا کوئی اجر نہیں ملا اور بعض ظالم ہیں کہ جنھوں نے قتل و غارتگری اور عصمت دری کی اور دوسروں کا مال لوٹا اور انھیں کوئی سزا نہ ملی اور یہ چیز عدالت کے خلاف ہے۔ پس کوئی مستقبل موجود ہے جہاں اسے اس کا پھل ملیگا اور وہی قیامت ہے، اس دن اعمال کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی۔ اگر قیامت نہ ہوتی تو اعمال کی قدر و قیمت معلوم نہ ہوتی۔

خلاصۂ اصول دین

۲

الرّسُول

○ تمہید

○ رسول اکرمؐ کی نبوّت کا ثبوت

اجتماعی اور فردی مصالح میں ٹکراؤ

مقصد خود بخود وجود میں نہیں آسکتا بلکہ ہر انسان اپنے مقاصد کو اپنی مصلحت اور ضرورتوں پر تطبیق کرتا ہے ان ضرورتوں کو ماحول اور زمان و مکان بھی انسان کیلئے معین کرتے ہیں لیکن جو عوامل انسان کو مقصد کی طرف لے جاتے ہیں، ان کی مثال اس ہوا کی سی نہیں ہے کہ جو درخت کے پتوں کو حرکت دیتی ہے۔ بلکہ یہ تحریک مصالح کے ادراک سے معین وقت میں ہوتی ہے۔

مصالح کی دو قسمیں ہیں:

۱. وہ مصالح جن کا فائدہ انسان کو تھوڑی سی منزل طے کرنے کے بعد ہی مل جاتا ہے، جیسے انسان کسی کے لئے کام انجام دیتا ہے۔

۲. وہ مصالح ہیں جن کے لئے طولانی سفر طے کرنا ہوتا ہے اور ان کا فائدہ سماج کو پہنچتا ہے۔ اکثر ان دونوں مصلحتوں میں ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ یعنی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان سماجی مصلحتوں کے اقتضاء کے مطابق کام نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے نجی و شخصی فائدہ کے لئے کام کرتا ہے۔ جبکہ لوگوں کی اجتماعی زندگی میں اسی وقت سدھار آسکتا ہے جب سبھی مصالح اجتماع کے لئے کام کریں اسی توجہ پر اجتماعی اور فردی مقاصد میں تناقض ظاہر ہوجاتا ہے بلکہ فرد و اجتماع کے منافع کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہتی ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ہمیں ایک راستہ تلاش کرنا چاہئے تاکہ انسان فردی مفاد و منافع سے

ہٹ کر اجتماعی مصالح و مفاد کی طرف آجائے۔

نبوّت

نبوت انسان کی زندگی میں ایک خدائی ذریعہ اور ایسا قانون ہے جو کہ فردی مصالح کو اجتماعی مصالح میں تبدیل کرتی ہے اور انسان کو فردی منفعت والے مختصر راستہ سے ہٹاکر اجتماعی مصالح کے طولانی راستہ سے گذارتی ہے اور یہ ایسے اعلان پر ممکن ہوتا ہے کہ زندگی اسی مادی زندگی میں محدود نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے، اور انسان اپنے اعمال کی جزاء پانے کے لئے خدا کی طرف منتقل ہورہا ہے کہ ہر شخص وہاں اپنے اعمال کو دیکھے گا:

فمن یعمل مثقال ذرّة خیراً یرہ ومن یعمل
مثقال ذرّة شرّاً یرہ (زلزلہ/۷-۸)

جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

اور اسی قانون الٰہی کے ذریعہ مصالح اجتماعی کے طویل راستے، فردی منافع کی طرف پلٹتے ہیں یعنی قانونِ الٰہی کے سایہ میں اجتماعی فوائد بھی محفوظ ہوجاتے ہیں اور فردی فوائد بھی۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس تناقض کا ایک ہی حل ہے اور وہ نبوت و معاد پر عقیدہ رکھنا ہے اور یہ ایسا واحد راستہ ہے جو انسان کو سماج کی خدمت اور اس کے حقیقی مفادات کے درمیان مختار بناتا ہے۔
نبوت عامّہ کی بحث ختم ہوئی۔ اب نبوّت خاصّہ یعنی ہمارے نبیؐ کی نبوّت کے اثبات کا آغاز ہورہا ہے۔

رسول اکرمؐ کی نبوّت کا اثبات

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی نبوت کے اثبات کے سلسلہ میں ہم اسی طریقہ استدلال کو اپنائیں گے جس کو وجود صانع کے اثبات میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی استقراء کی عملی دلیل کے ذریعہ، ہم وہاں دو دلیل لائے ایک عادی اور دوسری عملی۔ یہاں بھی ہم اس طریقہ پر عمل کریں گے، اب ذیل کی مثالوں پر توجہ فرمائیں۔

اگر کسی رشتہ دار کا خط انسان کو ملے اور یہ رشتہ دار مکتب اطفال میں زیر تعلیم ہو اور انسان یہ دیکھے کہ خط عمدہ مضمون، علمی عبارات اور فنی قواعد سے مزین ہے تو انسان فوراً اس نتیجہ تک پہونچے گا کہ یہ خط ایک تعلیم یافتہ شخص نے اس بچہ کو لکھوایا ہے۔ اس استدلال اور استنتاج کے تجزیہ کے لئے ہم مندرجہ ذیل اقدامات کرنے پڑیں گے:

۱۔ اس خط کا لکھنے والا مکتب کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔

۲۔ خط ایسی فصیح عبارات عمدہ مضمون اور فنی مطالب پر مشتمل ہے جو معمولی افکار سے بالا ہیں۔

۳۔ استقراء ثابت کر چکا ہے کہ یہ خط ان خصوصیات کے ساتھ لیے بچہ

سے ممکن نہیں ۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ اس خط کے مطالب کسی دوسرے کے ہیں اور اس بچے نے اس خط کو لکھنے میں کسی سے مدد حاصل کی ہے یہ مثال روزمرہ کے معمول کے مطابق ہے ۔

دوسری مثال فزکس کے قوانین کے اعتبار سے ۔ یہ دلیل الکٹرون کو ثابت کرنے کیلئے پیش کی گئی ہے ۔ علم فزکس کے ایک سائنسدان نے اپنی تحقیقات میں ایک خاص قسم کی شعاع کو بند شیشہ کی نلی سے گذارا ۔ تجربہ کی غرض سے انہوں نے گھوڑے کے نعل جیسا مقناطیس کا ٹکڑا شیشہ کے درمیانی حصہ پر رکھا ، انہوں نے دیکھا کہ شعاع مقناطیس کے مثبت قطب کی جانب مائل ہوتی ہے اور اس کے منفی قطب سے دور ہوتی ہیں اس تجربہ کو انہوں نے مختلف ظروف میں متعدد بار آزمایا نتیجہ میں انہوں نے استقراء کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ کچھ خاص شعاعیں مقناطیس کے ذریعہ جذب ہوتی ہیں اور قوت جاذبہ مقناطیس کے مثبت قطب میں ہے ۔ استقراء اور تجربہ کے ذریعہ ہی فزکس کا سائنسدان جانتا ہے کہ معمولی نور مقناطیس کے ذریعہ جذب نہیں ہوتے ، لہٰذا ان مخصوص شعاعوں میں کوئی ایسی چیز ہونا چاہئے جو اس میں نہیں ہے ۔ اس کے ذریعہ انھوں نے اس بات کا پتا لگایا ہے کہ یہ شعاعیں ان باریک اجسام نے تشکیل پاتی ہیں جو منفی بار رکھتی ہیں اور یہ باریک اجسام منفی خصوصیت رکھنے والے ہیں اور تمام مواد میں موجود ہیں کیونکہ یہ سب مختلف مواد سے پیدا ہوتے ہیں یہ باریک اجسام ہی الیکٹران ہیں ۔ ان دو مثالوں کے خلاصہ سے اس طرح استدلال

ہوتا ہے کہ جب ہم ایسے اثر کو دیکھیں جو خود میں موثر عوامل کے تحت یکساں نہ ہو، یعنی عوامل اس میں دو طرح کا اثر رکھتے ہوں یا دوسری لفظوں میں نتیجہ ظروف اور عوامل سے بڑا ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان محسوس عوامل و ظروف کے ماورا کوئی اور شئے ہے جسکی طرف ہماری توجہ نہیں تھی اور ہم سے پوشیدہ رہ گئی ہے۔ اور یہ وہی چیز ہے جو پیغمبر اسلام کی نبوت اور رسالت کی صداقت پر مضبوط دلیل ہے جو آپ کو خدا کی جانب سے ملی ہے۔ یہ نتیجہ چند حسب ذیل مراحل سے ثابت ہوتا ہے:

پہلا قدم: یہ شخصیت جس نے اپنی رسالت کا پروردگار عالم کی جانب سے اعلان کیا ہے جزیرہ نما عرب سے تعلق رکھتی ہے، وہ جزیرہ نمائے عرب جو اس زمانہ میں ثقافتی، فکری، سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ تھا۔ پیغمبر حجاز کے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے — حجاز، جزیرہ نمائے عرب کا ایسا محدود علاقہ تھا جسمیں معاشرتی تکامل کے لئے کسی طرح کی زمین ہموار نہ تھی۔ خاص کر جزیرہ نمائے عرب کا یہ حصہ اپنے زمانہ کے تمدن سے بے بہرہ تھا اور اعتقادی پہلو سے شرک، بت پرستی اور نسل پرستی کے عقائد میں غرق تھا۔ یہی چیزیں ان کے درمیان اختلافات، جنگوں اور کشمکش کا سبب ہوتی تھیں۔ قبائل کے ہم قسم اور ہم پیمان ہونے کے سوا کوئی نظام حکومت رائج نہ تھا اقتصاد بھی اس علاقہ میں کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ پڑھنا لکھنا بھی جو کہ ثقافت کا ابتدائی مرحلہ ہے ان کے درمیان بہت کم تھا

کیونکہ وہ ان پڑھ معاشرہ تھا جس طرح کہ قرآن مجید میں آیا ہے ۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلو ا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔

(جمعہ/٢)

پیغمبر اکرمؐ بعثت سے پہلے عام لوگوں کی طرح رہتے تھے نہ پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے اور کسی سے کبھی کوئی تعلیم حاصل نہ فرمائی اسی لئے قرآن آپؐ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے :

وماکنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینک اذاً لارتاب المبطلون (عنکبوت/٤٨)

باوجودیکہ پیغمبر اکرمؐ پڑھتے اور لکھتے نہ تھے ، پھر بھی قرآنی آیات سے متعلق آپ کی معلومات اور آپ کے علمی کمال ان افراد کے مقابلہ میں واضح دلیل ہیں جو قرآن کو خدا کی جانب سے نہیں سمجھتے کیونکہ ان ہی آیات کو پیغمبرؐ اپنی قوم کے سامنے پڑھا کرتے تھے وہ قوم جو پیغمبرؐ کی زندگی کے جزئیات کو جانتی تھی اس کے باوجود کسی نے نہ اعتراض کیا اور نہ آپ کے دعوے کا انکار کر سکے ، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ بعثت سے پہلے ، علمی ، ثقافتی ، شعری اور تحریری شہرت بھی نہیں رکھتے تھے اور صداقت ، عفت و امانت داری کے سوا اپنے ہم سن و سال افراد پر کوئی ظاہری امتیاز نہیں

رکھتے تھے۔ بعثت سے پہلے چالیس سال تک آپ ان ہی لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتے رہے۔ اپنی بعثت کے لئے مقدمہ فراہم کئے بغیر آپ نے دفعتہً اپنی نبوّت کا دنیا والوں کے سامنے اعلان فرمایا۔ اسی لئے قرآن میں یہ مطلب بیان ہوا ہے:

قل لو شاء اللّٰہ ما تلوتہ علیکم ولا ادریکم بہ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون (یونس/۱۶)

پیغمبر اکرمؐ مکہ میں پیدا ہوئے اور بعثت سے پہلے فقط دو بار جزیرہ نمائے عرب سے مختصر مدت کیلئے باہر اس وقت تشریف لے گئے جب ایک بار آپ نے اپنے چچا ابوطالبؑ کے ہمراہ بچپن میں سفر فرمایا دوسری بار اس وقت جب آپ نے حضرت خدیجہؓ کے لئے تجارت کی غرض سے سفر اختیار فرمایا یہ سفر آپ کی حیات طیبہ کے تیسرے دہے کے درمیان واقع ہوا تھا اور چونکہ آپ کیلئے پڑھنا لکھنا ممکن نہ تھا اس لئے آپ یہودیوں یا عیسائیوں کی دینی کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے اسی طرح مکہ کے ماحول میں فقط شرک اور بت پرستی کے افکار تھے، لہٰذا پیغمبر اکرمؐ نے قرآن کو اس ماحول سے نہیں سیکھا اور آپ میں کسی طرح کی دینی یا غیر دینی فکر نے نفوذ نہیں کیا تھا یہاں تک کہ جزیرہ نمائے عرب کے مشہور حکیم قیس بن ساعدہ جیسے شخص کی فکر نے بھی نفوذ نہ کیا تھا جو نہ بت پرست

تھا نہ عیسائی نہ یہودی اور اگر رسول یہودی یا عیسائی فکری مصادر سے آگاہ ہونے کی کوشش فرماتے بھی تو یہ بات نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی اور آپ کے خلاف تمام سازشوں کے ساتھ اس مسئلہ میں دشمن خاموش نہ رہتے ۔

دوسرا قدم: پیغمبر اسلام نے جس رسالت کا دنیا میں اعلان کیا اور قرآن نیز اسلامی شریعت میں جس کا ذکر ہے ، وہ بہت سے خصوصیات اور امتیازات کی حامل ہے جن میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :

۱۔ اسلامی شریعت نے مسائل الٰہی میں بے نظیر ثقافت کو پیش کیا ۔ جیسے صفات خداوندی ، خدا کا علم اور اس کی قدرت ، خدا اور انسان کے درمیان رابطہ کی نوعیت ، بشریت کی ہدایت کے سلسلے میں انبیاء کی تاریخ اور یہ کہ تمام انبیاء ایک ہی رسالت کے حامل ہیں ۔ البتہ اپنے اپنے طریقہ کار اور امتیازات کے ساتھ جو ہر نبی سے مخصوص رہے ہیں ۔ پیغمبروں کی الٰہی سنتیں حق و باطل اور عدل و ظلم کے درمیان دائمی کشمکش ۔ الٰہی رسالتوں نے مظلومین کیساتھ ہمیشہ دائمی اور مضبوط ارتباط رکھا اور ناجائز بالا دستیوں سے ہمیشہ جنگ کی ہے ، اور یہ الٰہی ثقافت نہ فقط یہ کہ جزیرہ نمائے عرب کی پست ثقافت یعنی شرک و بت پرستی کی ثقافت سے کہیں بڑھ کر تھی بلکہ آج کی دنیا جن مذہبی ثقافتوں سے آشنائی رکھتی ہے ۔ ان سے بھی سب سے با عظمت ہے بلکہ اسلام کی یہ الٰہی ثقافت اس لئے آئی ہے تاکہ تمام ثقافتوں کی اصلاح کرے ۔ تمام انحرافات کو دور کرے اور انسان کو فطر

دعقل کی طرف بلائے ۔ ان تمام منصوبوں کو ایک ایسا غیر تعلیم یافتہ شخص لایا جس نے شرک آلود اور غیر متمدن معاشرہ میں آنکھ کھولی تھی ۔

۲۔ رسول اکرمؐ ایسی انسانی زندگی ، کام اور معاشرتی تعلقات کے لئے ایسی قدریں اور مفاہیم لائے اور ان کو معاشرہ میں نافذ فرمایا جوان افراد کی نظر میں بھی قیمتی احکام ہیں، جوان قوانین کے خدائی پہلو پر ایمان نہیں رکھتے تھے ۔ وہ جوان جو قبائلی معاشرہ میں پیدا ہوا اور اس نے یکسارگی قیام کیا اور بشریت کو اتحاد و یگانگت کی دعوت دی ۔

خودخواہی اور نسل پرستی بیجابرتری کے ماحول میں پلنے والے جوان نے ان سب فیوڈلی انصا کے خاتمہ کیلئے قیام کیا اور اعلان کیا :

الناس سواسیۃ کاسنان المشط

یعنی لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح باہم برابر ہیں ۔

اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم

یعنی تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو ۔

اس اعلان کی بازگشت اس حقیقت کی طرف ہے جس کے سایہ میں لوگ سکون و آرام کی زندگی بسر کریں ۔ یہ وہ منصوبہ ہے جو زندہ بگور ہونیوالی عورت کو مرد کی برابر اور انسانیت کو اس کے کمال تک پہونچاتا ہے ۔ وہ جوان جوایسے بیابان میں رہا ہے ، جہاں کے لوگوں کا مقصد فقط پیٹ بھرنا اور فخر ومباہات کرنا رہا ہے ۔ ایسے جوان نے انسانیت کے اعلیٰ مقصد یعنی کسریٰ و قیصر کے ظلم سے مترق

ومغرب کے مظلوموں کو نجات دلانے کیلئے قیام کیا ایسے ماحول میں جہاں سیاست اور اقتصاد کے بجائے سود، احتکار اور سامراجیت کا راج تھا، ایک رشید فرزند نے قیام کیا اور ان غلط نظاموں کو برطرف کرکے انکی جگہ معاشرتی، اقتصادی اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے احکام کو معیار قرار دیا، تاکہ:

"لا یکون دولۃ بین الاغنیاء"

"یعنی مال و دولت گھوم پھر کر فقط مالداروں کے ہاتھ میں نہ رہے۔"

اسی طرح اس جوان نے معاشرتی بہبودی اور کمال کا اعلان کیا۔ یعنی لوگ ایک دوسرے کے سایہ میں رہیں۔ ایسا تمدن پیش کیا، جس تک انسان سیکڑوں سال کے تجربے کے بعد بھی نہیں پہونچا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت مختصر مدت میں عرب معاشرہ کے اندر بڑی تبدیلیاں پیدا کردیں۔

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ قرآن کی عبارت میں انبیاء اور گذشتہ اقوام کی تاریخ اور حالات کے بہت سے موارد کو تفصیل کیساتھ بیان کیا گیا ہے جبکہ مکہ میں بت پرستی کا ماحول تھا۔ اور وہاں انبیاء کی تاریخ کی لوگوں کو بہت کم اطلاع تھی، اور چونکہ رسول گرامی امی تھے اور آپ نے تعلیم حاصل نہ فرمائی تھی لہٰذا آپ اس کو کہیں سے لے کر مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ یہودی اور عیسائی علماء کی ایک جماعت نے آپ سے مطالبہ کیا کہ ان کی دینی تاریخ کو بیان فرمائیں۔ تو آپ نے قرآنی آیات کے ذریعہ بہادری کے ساتھ جواب دیا۔ ذیل میں تاریخ انبیاء کے متعلق کچھ آیات پیش کی جارہی ہیں:

(۱) وماکنت بجانب الغربی اذ قضینا الی موسیٰ الامر وماکنت من الشاهدین۔ (قصص/۴۴)

(۲) ولکنا انشأنا قروناً فتطاول علیهم العمر وماکنت ثاویاً فی اهل مدین تتلوا علیهم آیاتنا ولکنا کنا مرسلین۔ (قصص/۴۵)

(۳) وماکنت بجانب الطور اذ نادینا ولکن رحمة من ربك لتنذر قوماً ما اتاهم من نذیر من قبلك لعلهم یتذکرون۔ (قصص/۴۶)

"تعجب خیز تو قرآن کی وہ حقیقی اور واقعی داستانیں ہیں۔ جو کتب عہد عتیق و عہد جدید سے نقل نہیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ ہم فرض بھی کرلیں کہ مذکورہ داستانیں پیغمبر کے عہد میں مشہور تھیں تو ان کتب سے لکھا جانا ان تمام تاریخی رودادوں کا منفی پہلو ہے جبکہ قرآنی داستانیں ایجابی پہلو رکھتی ہیں، یعنی نمونہ ہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ان دونوں عہدوں میں موجود داستانوں اور خرافات و اکاذیبات نیز عقل و فطرت سے ناسازگار باتوں کی اصلاح و تعدیل کرتا ہے۔

۴۔ "قرآن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بلاغت میں اس کا ایک ایسا مخصوص اسلوب اور روش ہے کہ قرآن پر ایمان نہ لانیوالے افراد نے بھی اس کو قرآن سے پہلے اور بعد والی عربی زبان کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا ہے؛ قرآن نے عربی زبان میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ اس کی ہمہ جہت لغوی اسلوب کی بنیاد پر ہے۔

قرآن اپنی مضبوطی اور مختلف تعبیرات کے اعتبار سے انکی تالیفات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ ولید بن مغیرہ نے جب قرآن سنا تو کہا :

واللہ لقد سمعت کلاماً، ما ھو من کلام الانس، ولا من کلام الجن، وانّ لہ لحلاوۃ وانّ علیہ لطلاوۃ، وان اعلاہ لمثمر، وانّ أسفلہ لمغدق، وانہ لیعلو وما یعلی، وانّہ لیحطم ماتحتہ۔

"یعنی میں نے ایسا کلام سنا جو نہ انسان کا کلام ہے اور نہ جن کا کلام ہے اسمیں شیرینی اور زیبائی ہے اس کا اوپری حصہ پھل دار درخت جیسا اور نچلا حصہ گوارا ہے یہ قرآن ترقی کی حالت میں ہے کوئی چیز اس پر غالب نہیں آتی۔ وہ اپنے سے کم درجہ کو مغلوب کرتا ہے۔"

جزیرہ نمائے عرب کے لوگ قرآن کو غور سے نہیں سنتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ قرآن ان کو متاثر کر دے۔ اور اس سے ڈرتے تھے کہ قرآن ان میں کوئی تبدیلی ایجاد نہ کر دے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں حیرت انگیز امتیازات پائے جاتے ہیں۔ اور دوسری تالیفات کی طرح زمانہ اس کو متاثر نہیں کرتا۔

عرب کے لوگ قرآن کے چیلنج کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تسلیم ہو گئے، اور اس کا مثل لانے یا اس کے مثل دس سورہ لانے یا ایک سورہ کبھی لانے سے انہوں نے عجز و ناتوانی کا اعلان کر دیا اور اس مطلب کو پیغمبر اکرمؐ نے بار بار اس قوم کے درمیان اعلان فرمایا۔ جن کا فن و ہنر فقط فصاحت و بلاغت تھا۔ اور ان کی سب

بڑی تمنا نور نبوت کو بجھانا تھی، پھر بھی وہ قرآن سے مقابلہ نہ کر سکے پھر بھی وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ قرآن کے ادبیات ان کی لغوی و فنی قدرت سے بالاتر ہیں۔ زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ انسان اس سرمایہ کو لایا ہے جو چالیس سال ان کے درمیان رہا۔ اور اس بات کا سابقہ بھی نہیں تھا کہ اس نے ان کے ادبی جلسات میں شرکت کی ہو اس مدت میں لغوی و ادبی نقطہ نظر سے اس کا اپنی قوم کے درمیان کوئی امتیاز بھی نہیں رہا۔ یہ سب پیغمبر اکرمؐ کی خصوصیتوں کے چند نمونے تھے جن کو ذکر کیا گیا۔

تیسرا قدم : جیسا کہ دوسرے قدم میں بیان کیا گیا، علمی استقراء کی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت، انسانی معاشروں کی تاریخ میں ایسی بے نظیر خصوصیات کی حامل ہے جو ظروف و عوامل سے بہت بالاتر تھی۔ جزیرہ نمائے عرب اس انقلاب کا ظرف تھا۔ اور باقی عوامل اس نہضت کے لئے بالکل آمادہ نہ تھے۔ ہم پھر اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ دنیا کی نجات بخش تحریکوں کے درمیان ایک کامل انسان نے ظہور کیا۔ لوگوں کا قائد اور راہنما ہوا اور ان کو آزادی، ترقی و کمال کی طرف لے گیا۔ لیکن اگر ہم دنیا کے تمام انقلابات کا اسلام کی مقدس تحریک سے مقایسہ کریں تو ہمیں کچھ فرق نظر آئیں گے، جن کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے :

(۱)۔ اس تحریک کے ذریعہ خود پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھوں زندگی کی قدروں اور اس کے مفاہیم کے تمام پہلوؤں میں حیرت انگیز اور ہمہ گیر تبدیلی پیدا ہوئی۔ آنحضرتؐ نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی۔ بت پرستی کا معاشرہ تیزی کے

ساتھ اس توحید کی طرف روانہ ہوا، جس نے تمام ادیان کی توحید کی اصلاح کی۔ توحید کے چہرے کو خرافات اور افسانوں کے غبار سے صاف کیا اور پسماندہ معاشرہ کو ایسا ترقی یافتہ معاشرہ بنا دیا جو دنیا کے تمام معاشروں کا راہ گشا ہوا۔

(۲) دوسری جانب جس معاشرہ میں بھی انقلاب واقع ہوتا ہے وہ اچانک رونما نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بہت سے مقدمات اور مراحل کا نیازمند ہوتا ہے۔ پہلے لوگوں میں روحی اور فکری آمادگی ایجاد ہونا چاہئے۔ پھر وہ فکر پختہ ہو پھر قیادت کے لئے لیاقت والا رہنما ہونا چاہئے۔ پھر انقلاب کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ اتحاد کا پھل آنے کے بعد انقلاب کشمکشوں سے گذر کر مقصد کی طرف قدرت کیساتھ پیشرفت کرے، اور دشمن پر غلبہ حاصل کرے۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ کی مقدس نہضت اور رسالت میں ان میں سے کوئی مقدمہ اور مرحلہ نہیں تھا بلکہ یہ تحریک صدر اسلام کے برگزیدہ افراد کے ذریعہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ہاتھوں اچانک شروع ہوئی آپ خود اس تحریک اور الٰہی انقلاب کے بانی تھے۔ انبیاء کی تاریخ کے سلسلے کے علاوہ آپ کی تحریک کسی اور سلسلے کی کڑی نہ تھی۔

(۳) تاریخی لحاظ سے یہ ثابت ہے کہ ہر وہ فکری، اعتقادی اور معاشرتی رہنما جو خود اپنی ایجاد کے ذریعہ کسی تحریک کی قیادت کرتا ہے۔ اس کو تجربہ کی بنیاد پر اس تحریک کی مخصوص ثقافت کا حامل ہونا چاہئے۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ نے ذاتی طور پر ایک فکری، اعتقادی اور معاشرتی انقلاب کی راہنمائی فرمائی جبکہ آپؐ امّی تھے اور کسی دنیاوی درسگاہ کے پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس کے علاوہ اپنے زمانہ نیز

گذشتہ ادیان کی ثقافت کی بھی کوئی اطلاع نہ رکھتے تھے ۔ اسی طرح آپ کو قیادت کے سلسلے میں بھی کوئی تجربہ نہ تھا ۔

(۴) اب ہم چوتھے مرحلہ یعنی نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ جب ہم خلاف عادت کوئی ایسا حادثہ دیکھیں جو حسی ظروف اور عوامل کے لحاظ سے معقول نہ ہو تو ہم کو جاننا چاہئے کہ ہماری نظروں سے مخفی ایک عامل اس میں کارفرما ہے اور وہ عامل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے سلسلے میں وحی الٰہی ہے ۔ اسی معنیٰ نے آسمان وزمین کو باہم متصل کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :

وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نهدی به من نشاء من عبادنا وانک لتهدی الی صراط مستقیم

(شوریٰ / ۵۲)

"یعنی ہم نے اسی طرح تمہاری جانب قرآن کو اپنی طرف وحی کے ذریعہ بھیجا تو نہ کتاب ہی کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو ، مگر ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا ہے تاکہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو سیدھا ہی راستہ دکھاتے ہو ۔"

پیغمبرؐ کی تحریک اور رسالت میں مؤثر عوامل

گذشتہ مطالب کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم رسالت کی فقط وحی کی بنیاد پر تفسیر کریں، یعنی یہ کہیں کہ حسی اور مادی عوامل امر رسالت میں مؤثر نہیں تھے بلکہ مقصود یہ ہے کہ حسی اور مادی عوامل فقط فطری و طبیعی روش میں مؤثر ہیں اگرچہ رسالت اپنے معنی کے لحاظ سے حقیقی اور الٰہی ہے اور حالات و مادی ظرفیت سے بالا ہے لیکن یہ رسالت جب عمل کی طرف بڑھے تو محسوسات سے رابطہ برقرار کر سکتی ہے مثلاً ایک انسان غصہ کے عالم میں ایک چیز کو پھاڑنا یا تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی حال میں تصور کرتا ہے کہ اس کا خدا جسم والا ہے اسی لئے غصہ میں وہ اپنا پیر بت پر مارتا ہے یا اگر بت حلوا ہے تو بھوک کے عالم میں اس کو کھا جاتا ہے۔ یہی فطری شعور اس کو نئی رسالت کے متعلق تحقیق کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسری مثال یہ کہ غریب اور زحمت کش عرب معاشرہ پر استعماریوں کی جانب سے ظلم و ستم ہوتا ہے۔ مظلومیت کا یہی احساس اس کو نئی اسلامی تحریک کی مدد کرنے اور پرچم عدالت کو بلند کر کے سود خوروں سے نجات حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تیسرا نمونہ وہ قبائلی شعور اور رسومات جو جزیرہ

نمائے عرب کے لوگوں میں رائج تھیں جیسے قبائل قریش کے درمیان کے اختلافات اور پیغمبر اکرمؐ کے قبیلہ کے ذریعہ آپ کی طرفداری اور دشمنوں سے آپ کی حفاظت یا اس وقت کی دو طاقتور حکومتوں: ایران و روم کے درمیان اختلاف جو آپس میں برسر پیکار تھیں. اور اس اختلاف نے ان کو جزیرہ نمائے عرب میں دخل دینے کا موقع نہ دیا۔ یہ ایسے نمونے تھے کہ جن میں محسوس عوامل بالواسطہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی ترقی میں مؤثر تھے. لیکن ہم ان عوامل کی رو سے پیغمبرؐ کی نبوت اور رسالت کی تفسیر نہیں کر سکتے بلکہ پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور نبوت لیے الٰہی معانی کی حامل ہے جو مادی حدود اور شرائط سے بالاتر ہیں یہاں پیامبری کی بحث ختم ہوئی۔ اب رسالت اور پیام کی بحث شروع ہوتی ہے۔

الرّسالۃ

○ رسول اکرمؐ کی رسالت

○ کتاب "الفتاوی الواضحہ"

رسول اکرمؐ کی رسالت اور آپؐ کا پیغام اسلام ہے

اسلام وہ دین ہے جس کی تبلیغ کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر رحمت حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہے اور ان کی توصیف میں فرمایا ہے:

وما ارسلناك الا رحمةً للعالمین

اسلام کا سب سے پہلا مقصد انسان کو خدا اور روز جزاء سے مربوط کرنا ہے انسان اور خدائے یکتا کا رابطہ انسان کی فطرت کا جزء رہے۔ اسلام نے اس فطرت پر زور دیا ہے تاکہ انسان کو شرک کی مختلف قسموں سے نجات دے۔ اسلام کا سب سے پہلا مذہبی نعرہ "لا الٰہ الا اللہ" ہے اور جو کہ نبوت خدا اور مخلوق کے درمیان رابطہ اور خدا کی طرف توجہ کے اثبات کے لئے مضبوط معیار ہے۔

انسان کا روز جزا اور عقیدۂ قیامت سے رابطہ اس دنیا میں اختلافات کے حل اور عدل الٰہی کو وجود بخشنے کا واحد ذریعہ ہے جس طرح کہ گذشتہ بحثوں میں اشارہ ہوا۔ اور آنیوالی بحثوں میں بھی بیان کیا جائے گا۔ اسلام کا پیام اور اسکی رسالت تمام آسمانی رسالتوں سے برتر ہے اور ایسی خصوصیات کی حامل ہے جنمیں سے بعض کو مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے:

(۱) اسلام کی رسالت اور اس کا پیام قرآن میں بیان ہوا ہے اور قرآن تمام آسمانی کتب کے مقابلہ میں تحریف سے محفوظ رہا ہے جبکہ باقی کتب آسمانی میں تحریف ہوگئی ہے۔ اور ان کے بہت سے مطالب حذف ہوگئے ہیں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (حجر/۹)

یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں۔

تحریف ہونیوالی رسالت اور اس کا پیام انسان اور خدا کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے قابل نہیں کیونکہ یہ رابطہ نام کا رابطہ نہیں بلکہ معنوی رابطہ ہے۔ اور فکر و روش کے لحاظ سے رسالت کے مفہوم سے وابستہ ہے یعنی ایک رسالت اور اس کے پیغام (عقائد و احکام) کو تحریف سے محفوظ ہونا چاہیئے اس لئے اسلام کی سلامتی قرآن کی سلامتی سے وابستہ ہے۔ اور چونکہ قرآن مضبوط دلیلوں کے ذریعہ تحریف سے محفوظ رہا ہے اس لئے اپنے پیروکاروں کو اعلیٰ انسانی مقاصد تک پہونچا سکتا ہے۔

(۲) مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآنی عبارت کمی و زیادتی کے بغیر باقی رہی ہے اور عبارت قرآن کا باقی رہنا گویا پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کا باقی رہنا ہے اور یہ آپ کی نبوت کے اثبات کا اہم ذریعہ ہے کیونکہ ہم بحث نبوت میں کہہ چکے ہیں کہ دلیل استقراء کے ذریعہ پیغمبرؐ کی نبوت قرآن کے وسیلہ سے ثابت ہوتی ہے۔ اور جب تک قرآن باقی ہے، یہ دلیل باقی ہے۔ برخلاف دیگر نبوتوں

سکے کہ ان کے اثبات کی دلیل معین زمانہ کے حوادث اور واقعات تھے ، جیسے جناب عیسیٰؑ کی نبوت جو معجزہ کے ذریعہ ثابت ہے ۔ یہ معجزہ مادر زاد اندھے، کوڑھی اور برص کے مریض کو شفا دینا تھا ۔ یہ معجزہ اس زمانہ کے لئے کافی تھا لیکن آج اس معجزہ کے ذریعہ جناب عیسیٰ کی نبوت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اس میں اب کوئی زور نہیں اور جس میں کوئی زور اور قوت نہ ہو خدا لوگوں کو اس کا مکلف نہیں فرما سکتا کہ وہ ضرور بالضرور اس کے معتقد ہوں اسی لئے ارشاد ہوتا ہے :

"لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها" (بقرہ/۲۸۶)

یعنی ذمہ داری وسعت اور توانائی کے اعتبار سے ہے ۔ جسمانی قوت و توانائی یا فکری توانائی اور آج ہم جو گذشتہ انبیاء پر اعتقاد و ایمان رکھتے ہیں ۔ وہ قرآن کے ان کی نبوت کی خبر دینے کی بناء پر ہے ۔

(۳) زمانہ کی رفتار اسلام کی بنیادی دلیل یعنی قرآن کو بے قیمت نہیں کر سکتی بلکہ گذرتے ہوئے زمانہ نے قرآن کے ایسے مختلف پہلوؤں کا پتہ لگایا ہے ۔ جن تک سائنس سالوں سال بعد پہونچی ہے ۔ اس لئے کہ قرآن مخلوقات ، زمینوں اور باقی موجودات کی خلقت میں تفکر اور ان کے اسرار کے مطالعہ کے ذریعہ انسان کو خدا سے مربوط کرتا ہے ۔ یہاں تک کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک انگریز ماہر ادبیات نے ہوا کے ذریعہ نباتات کی تلقیح کا پتہ لگانے کے بعد کہا :

ان اصحاب الابل قد عرفوا ان الریح تلقح الاشجار والثمار قبل ان یتوصل العلم فی اوروبا الیٰ ذالک بعدة قرون

یعنی عرب کے اونٹ چرانے والے ہوا کے ذریعہ اشجار کی تنقیحی کیفیت کو سائنس سے پہلے جان چکے تھے۔

(۴) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی رسالت اور آپ کا پیغام زندگی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے اور اس بناء پر رسالت مختلف تقاضوں کے درمیان توازن برقرار کرسکتی ہے اور ایسی بنیاد قائم کرسکتی ہے۔ جو مزدور اور کسان نیز فرد اور معاشرہ کے درمیان ربط قائم کرسکے اور انسان کو مادی اور معنوی زندگی کے درمیان سرگردانی سے رہائی دلا سکے۔

(۵) یہ اس یگانہ آسمانی رسالت کا پیغام ہے جس نے صرف نعرہ پر اکتفاء نہیں کی بلکہ وہ اپنے اعلان کئے ہوئے نعرہ کو لوگوں کی زندگی میں نافذ بھی کرسکتا ہے

(۶) یہ رسالت اور اس کا پیغام تاریخ ساز ہے اور اس طراز کے مانند ہے جس سے عمارت کی کجی درست کی جاتی ہے تاریخ اس رسالت کے ہمراہ چلتی ہے اور اس کے نور سے استفادہ کرتی ہے لیکن چونکہ یہ آسمانی رسالت ہے اور مادی عوامل سے بالاتر ہے اس لئے تاریخ کے آگے جھکتی نہیں ہے یعنی تاریخ اس کی طرز رفتار کو بدل نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ رسالت غیبی عامل پر تمام ہوتی ہے۔ اور مادی محاسبات سے مطابقت نہیں رکھتی، لہٰذا اس رسالت کی تاریخ کو مادی

عوامل کے تحت سمجھنا غلط ہے اور جب تک ہم اس رسالت کو ایک الٰہی حقیقت کے سانچے میں دیکھیں، اس کی تاریخ کو نہیں سمجھ سکتے۔

(۷) اس رسالت اور اس کے پیغام نے فقط امت اسلام کی تشکیل پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اس کا ارادہ مسلمین کی ایک ایسی طاقت وجود میں لانا ہے۔ جو دنیا کی اصلاح کرے۔ چنانچہ بعض با انصاف یورپی دانشوروں نے اس کا اعتراف یوں کیا ہے کہ اسلام کی ثقافتی تحریک نے یورپ کی سوئی قوموں کو جگا کر ان کو راستہ دکھایا ہے۔

(۸) یہ رسالت اور پیام گذشتہ تمام انبیاء کی رسالت سے ممتاز ہے کیونکہ یہ دین خدا کی ایسی آخری پیشکش ہے جس کی رسول اسلامؐ کے ذریعہ تبلیغ ہوئی ہے۔ اس خاتمیت کے دو معنی ہیں ایک منفی یعنی آپ کے بعد کوئی نبیؐ نہیں آئیگا دوسرے مثبت یعنی قیامت تک آپکی نبوت کے باقی رہنے کا اعلان ہے۔

جب ہم نبوت کے منفی معنی یعنی رسولؐ کی خاتمیت کو مدنظر قرار دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے احکام پوری چودہ صدیوں میں واقعات کے مطابق رہے ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی حقیقت کے مطابق رہیں گے۔ اسی لئے مگر خاتم النبیینؐ کی نبوت تمام نبوتوں کے امتیازات کی حامل ہے۔ اسی لئے تمام زمانوں میں اپنے استمرار اور دوام کو باقی رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں اعلان ہوتا ہے:

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ

من الکتاب ومھیمنا علیہ

(مائدہ/۴۸)

یعنی اے رسولؐ ہم نے آپؐ پر برحق کتاب نازل کی جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کی نگہبان ہے۔ لہٰذا آپ تنزیل خدا کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کریں۔

(۹) جب خدا نے نبوت کو ہمارے پیغمبر حضرت محمدؐ بن عبداللہ پر ختم فرمایا تو اس کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ اسلامی امت کی امامت اور خلافت کے لئے کچھ اوصیاء اور جانشین منصوب فرمائے۔ رسولؐ نے ان روایات صحیحہ کے مطابق جو تمام مسلمین کے درمیان مسلّم ہیں، ان کی تعداد اور اسمائے گرامی اور ان کی پہچان بیان فرمائی ہے، ان میں پہلے حضرت علی علیہ السلام ان کے بعد امام حسنؑ، پھر امام حسینؑ ان کے بعد علی الترتیب ان کی اولاد میں حضرت علیؑ بن حسینؑ پھر محمد بن علی الباقرؑ پھر جعفر بن محمد الصادقؑ پھر موسیٰ بن جعفر الکاظمؑ پھر علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ پھر محمد بن علیؑ الجوادؑ پھر علیؑ بن محمدؑ الہادی پھر حسن بن علی العسکری پھر محمد بن حسنؑ المہدی علیہم السلام ہیں۔

(۱۰) امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی غیبت کے زمانے میں لوگوں کو احکام اسلامی میں فقہاء اور علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور باب اجتہاد کو کھول دیا ہے تاکہ لوگوں کی ضرورت برطرف

ہوتی رہے ۔ اجتہاد یعنی کتاب و سنت اور باقی مدارک اسلام کے ذریعہ احکام کے استنباط کی کوشش کرنا ہے ۔

الحمد للہ رب العالمین